December
2021

جدید ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

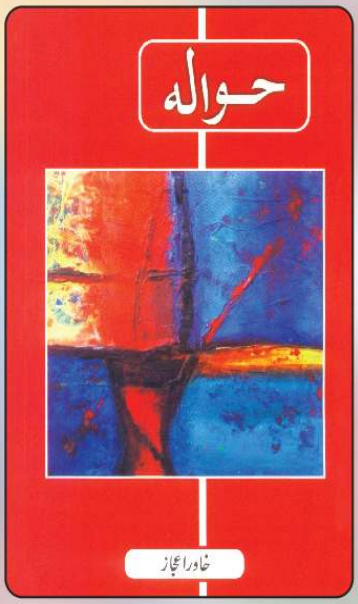
حوالہ
خاور اعجاز

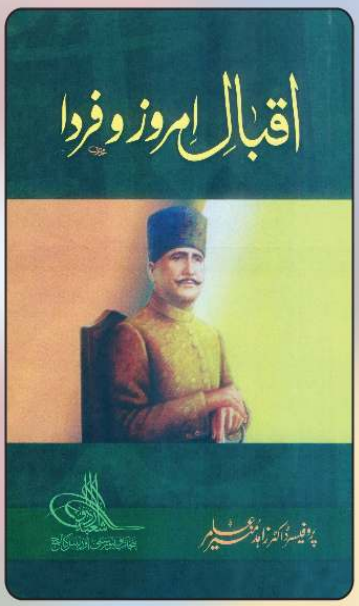
اقبالِ امروز و فردا
پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر

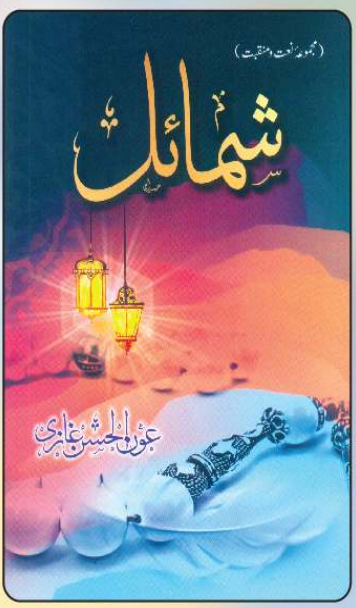
(مجموعہ نعت و منقبت)
شمائل
عون الحسن غازی

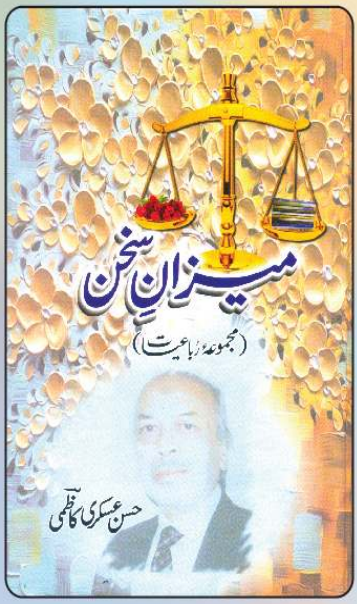
میزانِ سخن
(مجموعہ رباعیات)
حسن عسکری کاظمی

بانی مدیر: خالد احمد

آنسو

راہ میں نہیں رُکتے
لاکھ ٹھوکریں کھا کر
خاک پر نہیں جُھکتے
دُور آسماں پا کر
راستے کہاں آ کر
راستا بدلتے ہیں
تیرگی سے اُکتا کر
روشنی میں ڈھلتے ہیں
آنکھ سے نکلتے ہیں
ساتھیو کی خاطر کیوں
ایک چال چلتے ہیں
شبنمی مسافر کیوں
انگلیاں تمہاری ہیں
پُتلیاں ہماری ہیں

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 29 - دسمبر 2021 - شمارہ نمبر: 12

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

ماہنامہ ریاض: لاہور دسمبر 2021ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی، شہاب صفدر، سرور حسین نقشبندی	7 تا 9
2	نعت	حسن عسکری کاظمی، محمد یٰسین قمر، خورشید ربانی، محسن اسرار، غلام حسین ساجد، سرور حسین نقشبندی، محمود کیفی	10 تا 16
3	عقیدت	انصر حسن، راجہ عبدالقیوم، مرزا آصف رسول	17 تا 19
4	رباعیات	خالد علیم	20
5	ہائیکو	خاور اعجاز	21
6	ماہیے	ممتاز راشد لاہوری	22
7	گیت	گلزار بخاری	23
8	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	24 تا 28
9	تہذیب قرآنی اور انسانی معاشرہ	سیدہ آیت گیلانی	29 تا 34
10	افسانے	حنیف باوا، محمد حنیف، افشاں سجاد، ثمینہ سید، وقار احمد ملک، نور کمال شاہ، نورین روما	35 تا 78
11	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	79 تا 88
12	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، جلیل عالی، جمیل یوسف، ماجد اسلام امجد، حسن عسکری کاظمی، سید ریاض حسین زیدی، محسن اسرار، خاور اعجاز، نسیم سحر، بشیر رزمی، رشید آفرین، صفدر صدیق رضی، محمد انس انصاری، راحت سرحدی، سید ضیاالدین نعیم، عقیل رحمانی	89 تا 191

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
12	غزلیں	گلزار بخاری، شوکت محمود شوکت، یونس خیال، اکرم ناصر سید قاسم جلال، اقبال سروبہ، فرحت عباس، منظور ثاقب تصور اقبال، حامد یزدانی، علی اصغر عباس، افضل گوہر، اعجاز روشن طارق بٹ، شہاب صفدر، زکی طارق، احمد جلیل، کرامت بخاری سحر تاب رومانی، یعقوب پرواز، قمر رضا شہزاد، نیلما ناہید درانی بدر منیر، اشرف کمال، رخشندہ نوید، شاہد اشرف، آفتاب خان محمد نوید مرزا، ہمایوں پرویز شاہد، ارشد محمود ارشد، رومانہ رومی ریاض ندیم نیازی، حسنین سحر، دانش عزیز، شاہد فرید، فیض رسول فیضان زبیر فاروق، عاصم اعجاز، اکرم جاذب، شبانہ عشرت، وسیم جبران سرور فرحان، عاطف جاوید عاطف، عدنان خالد، عزیز نبیل افتخار شاہد، احمد حسین مجاہد، عزیز عادل، شاہد ماکلی، سید فرخ رضا ترمذی مرزا سکندر بیگ، میثم محسن، کاشف حسین غائر، صغیر احمد صغیر فخر عباس، سید ضیا حسین، بشیر احمد حبیب، حمید حیدر اعوان شہزاد احمد شیخ، علی حسین عابدی، عزیز فیصل، تاثیر جعفری محسن رضا ثانی، عمران اعوان، کوکی گل، نبیل یاز اسحاق وراگ، نائیلہ راٹھور رخسانہ سمن، نعیم رضا بھٹی، عزم الحسنین عزمی، شہاب اللہ شہاب عمر قیاز قائل، نازیہ رحمان، حکیم خان حکیم، امتیاز انجم رضا اللہ حیدر، محمد علی ایاز، احمد محسود، علی فیضان جعفری ساجد رضا خان، صائمہ آفتاب، اذور شیرازی، آفتاب محمود شمس زین علی رضوی، سرفراز عارض، ارسلان ساحل، نوید صادق	89 تا 191
13	شاعرِ امروز	جواد جاذل (جیم جاذل)، نادر عریض [شاہد ماکلی]	192 تا 198
14	طنز و مزاح / خاکہ	ہمایون خان	199 تا 202
15	نظمیں	آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، خورشید رضوی، غلام حسین ساجد خاور اعجاز، نسیم سحر، صفدر صدیق رضی، ممتاز راشد لاہوری، حامد یزدانی شبہ طراز، اقبال سروبہ، امجد بابر، دانش عزیز، ارشد محمود ارشد رخشندہ نوید، نائیلہ راٹھور، فیض رسول فیضان، آشا تھ کنول، فرح شاہد ظہور چوہان، سید تحسین گیلانی، زعیم رشید، عاصمہ شہزادی، ازہر ندیم	203 تا 227
16	خطوط	آصف ثاقب، محمد ارشاد، کرامت بخاری، نسیم سحر ممتاز راشد لاہوری، آفتاب احمد ملک، اشرف کمال، آشا تھ کنول محمد شفیق انصاری، رانا محمد شاہد، انعام الحسن کاشمیری	228 تا 241

حمد

میں کہ تھا تشکیک کی بے نور دلدل کا اسیر
نورِ ایماں سے مزین ہو گیا، بدرِ منیر

غربتِ کم مائیگی سے ہو گئی میری نجات
مجھ کو عرفانِ خدا نے کر دیا ثروت نظیر

ہو گیا ارفع و اعلیٰ صاحبِ تقویٰ جو ہے
وہ فقیرِ بے نوا ہو یا شہنشاہِ شہیر

جس نے کشکولِ گدائی تیرے آگے رکھ دیا
ظاہر و باطن کی دولت سے ہوا بے حد امیر

جس نے صدقِ دل سے مانا تو ہے شہ رگ سے قریب
ہو گیا تیرے قریں، وہ ہو گیا تیرا نصیر

وہ سرافرازِ جہاں ہوتا گیا تیرے طفیل
خیر جو ذوقِ عمل سے جو ہوا حرکت پذیر

بے سر و ساماں ہونے سے سراسر بچ گیا
جس کا ہے دل سے عقیدہ تو ہے واحد دستگیر

سب رموزِ عشق و دانش اس پہ وا ہوتے گئے
جس کی چشمانِ تحیر نے کیا ان کو اسیر

جو بتانِ بے بصر کی راہ پہ تھا گامزن
لا الٰہ کی تو نے پھیری اس پہ تنسیخی لکیر

بس وہ استغنا کی دولت سے مشرف ہو گیا
صدقِ دل سے جو ہوا ہے تیرے ہی در کا فقیر

اہتمامِ عدل و احساں کا ترا معیار ہے
چشمِ منصف میں برابر کیا کبیر اور کیا صغیر

حضرتِ انساں کو تو نے عطا کیں قدرتیں
اپنے اپنے دائرے میں ہر کوئی عبدالقدیر

تو نے احساسِ زیاں سے اس کی آنکھیں کھول دیں
احتسابِ خود نگر سے جو ہوا روشن ضمیر

ارضِ خاکی سے اٹھائے تو نے کیا کیا آسماں
ہیں صدف کی گود میں کیسے جواہر بے نظیر

ہو گئے علم و بصیرت کے مراتب ارجمند
تیرا فیضانِ نظر ہے، العلیم و البصیر

میں ریاضِ حمد میں سو جان سے ہوں منہمک
مجھ کو راہِ شہرِ طیبہ کا بنا دے راہ گیر

سید ریاض حسین زیدی

حمد

حُسن کی راہگزر اِلااللہ
خیر کا زادِ سفر اِلااللہ

گوشِ ہستی میں فسوں پھونکتا ہے
ہاتفِ شام و سحر اِلااللہ

یورشِ وہم و گماں لامعبود
پُریقینوں کی سپر اِلااللہ

ناخدا خود کو سمجھتا ہے خدا
اُٹھ کے کہتے ہیں بھنور اِلااللہ

زیست دہراتی ہے حق ہو حق ہو
موت دیتی ہے خبر اِلااللہ

کچھ نہیں کچھ نہیں جو کچھ ہے یہاں
سب شرف سارے ہنر اِلااللہ

بے اماں دھوپ کے صحرا میں بھی
سایہ زن ایک شجر اِلااللہ

ظلم و ظلمت کے مددگار اُدھر
ہم نفس ایک اِدھر اِلااللہ

سرِ ہر معرکہ کہتا ہے شہاب
عشق بے خوف و خطر اِلااللہ

شہاب صفدر

حمد

پیکرِ جاں میں نور تیرا ہے
ہر نفس میں ظہور تیرا ہے

پتہ پتہ تری گواہی دے
ڈالی ڈالی پہ بور تیرا ہے

تو ہر اک جا بھی ہے مگر مسکن
ماورائے شعور تیرا ہے

گفتگو سے مہک نہ کیوں آئے
ذکر بین السطور تیرا ہے

لطفِ عصیاں سرشت بندوں پر
پھر بھی رب غفور! تیرا ہے

تجھ سے کچھ بھی نہیں ہے پوشیدہ
سب غیاب و حضور تیرا ہے

آنکھ یک دم کھلی ہے پچھلے پہر
یہ بلاوا ضرور تیرا ہے

حرف و صوت و ثنائے سرور میں
سارا جذب و وفور تیرا ہے

سرور حسین نقشبندی

نعت ؐ

تحفۂ نعت جو محفل میں سخنور لائے
کوزۂ حرف میں خوشبو کا سمندر لائے

جو سرِ بزم جسے آئے میسر لائے
داغِ عصیاں تو کوئی اشک کے گوہر لائے

رفعتِ عرش فقط خاک نشینوں پہ کھلی!
آسمانوں کی خبر جب وہ زمیں پر لائے

ہر قدم جستِ گم گشتہ کی جانب اُٹھا
کس بلندی پہ وہ انساں کا مقدر لائے

زر پرستوں کو کیا زیر فقیروں نے حسنؔ
آیتیں ڈھونڈ کے قرآں کی جو بوذرؓ لائے

حسن عسکری کاظمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

حُسنِ آخر نے کیا حُسن کو آخر تجھ پر
آخری رُوپ دیا ، آخری سُورت لکھی

نعتؐ

آپؐ کی بات گو مسلسل ہو
آپؐ کا ذکر کب مکمل ہو؟

آنکھ سے کیوں جدا بصیرت ہو؟
کیوں مدینہ نظر سے اوجھل ہو؟

مصطفیٰؐ کے سوا ہے کب ممکن؟
کوئی کامل ہو، کوئی اکمل ہو

ریگزارِ جہاں میں یادِ اُنؐ کی
آبِ کوثر کی جیسے چھاگل ہو

فکر و دانش کی خشک دامانی
اُنؐ کی موجِ کرم سے جل تھل ہو

قبر کیا، حشر کیا؟ مرے مولا!
اُنؐ کی رحمت کا ساتھ ہر پل ہو

ذکرِ خیرالوریٰ سکوں بخشے
جب طبیعت ہماری بوجھل ہو

ہو مرا آج وقف اُن کیلئے
اُنؐ سے منسوب میرا ہر کل ہو

وردِ صلِ علیٰ کے صدقے میں
مسئلہ جو بھی ہو قمر حل ہو

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

یہ خیر خواہیِ اُمت نشانِ رحمت ہے
''حضورؐ آپ کا اُسوہ جہانِ رحمت ہے''

کھلا ہے بابِ عطا دوست ہو کہ دشمن ہو
یہ شانِ فضل و کرم ہے، یہ شانِ رحمت ہے

وہ آفتابِ قیامت، یہ دھوپ دنیا کی
خوشا کہ سایۂ دامانِ جانِ رحمت ہے

بجھائے حرف بھی مضمون بھی وہی بخشے
یہ نعت گوئی عطائے بیانِ رحمت ہے

خطا کے دشت میں بھٹکے ہوئے مسافر کا
ٹھکانہ ہے تو فقط گلستانِ رحمت ہے

کلامِ پاک ہے سیرت رسولؐ اکرم کی
رسولِؐ پاک کا فرماں بیانِ رحمت ہے

ہوا ہے حاتمِ طے نامور سخاوت میں
مگر جو فیض رساں خاندانِ رحمت ہے

خورشید ربانی

نعتؐ

دکھائی دیتی ہیں سچائیاں مدینے میں
سلام کرتی ہیں بینائیاں مدینے میں

خدا کے فضل پہ ایمان لانے لگتی ہیں
ہماری سوچ کی گہرائیاں مدینے میں

خدا کا سایہ نہیں ہے پہ ہم نے دیکھی ہیں
خدا کے نور کی پرچھائیاں مدینے میں

سخن ورو! مرے آقا کے در کے ہو جاؤ
خرد کو ملتی ہیں دانائیاں مدینے میں

ہزار ردِ بلا ہے وہاں کی آب و ہوا
بکھر رہی ہیں مسیحائیاں مدینے میں

چراغ بن کے نکلتے ہیں ان کے در سے وجود
بہت ہیں انجمن آرائیاں مدینے میں

تلاش، حسن کی ثابت وہیں پہ ہوتی ہے
عیاں ہیں خلد کی رعنائیاں مدینے میں

ساعتوں کی ضمانت ہے ان کے شہر کی رت
کلام کرتی ہیں تنہائیاں مدینے میں

نگاہ رکھتے ہو محسن تو پھر مدینے چلو
قدم قدم پہ ہیں زیبائیاں مدینے میں

محسن اسرار

نعتؐ

خاک کا پُتلا ہوں لیکن منحرف ہوں خاک سے
ہے مجھے قلبی ارادت سیّدِ لولاک سے

سانس لیتا ہوں تو خوشبو سے مہک اٹھتا ہوں میں
دل کی ہر دھڑکن کو نسبت ہے رسولِ پاک سے

سُنبل و ریحاں ہیں اُن کے کاکُلِ پیچاں کا نقش
رس ٹپکتا ہے لبِ شیریں کا شاخِ تاک سے

گُنبدِ خضرا کی تابانی کا کیا مذکور ہو
نور کی بارات اُتری ہے کہیں افلاک سے

چُومتا ہے آپ کے قدموں کی مٹی آسماں
ماورا ہے آپ کی رفعت حدِ ادراک سے

آپ کے ہاتھوں مِلے گی ایک دن صورت مجھے
اس لیے میں آج تک اُترا نہیں ہوں چاک سے

غلام حسین ساجد

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

لکھتے ہی اُنؐ کا اِسم مُبیںؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ ورق پہ کاہ کشانِ سخن تمام

نعتؐ

چھوڑ کے عشق بتاں نعت لکھی جاتی ہے
بھول کر سود و زیاں نعت لکھی جاتی ہے

حرف تاروں کی طرح کیسے چمک اٹھتے ہیں
نور ہوتا ہے جہاں نعت لکھی جاتی ہے

اذن ممدوح سے کھلتی ہے گرہ مدحت کی
وہ نہ چاہیں تو کہاں نعت لکھی جاتی ہے

کوئی یہ کہہ کے مجھے بزم غزل سے لایا
تم ادھر آؤ یہاں نعت لکھی جاتی ہے

صحبدم صحن حرم میں کہیں گنبد کے قریں
کیا بتاؤں جو وہاں نعت لکھی جاتی ہے

میں تصور میں پہنچ جاتا ہوں قدموں کے قریں
اشک ہوتے ہیں رواں نعت لکھی جاتی ہے

ہاؤ ہو کرنا تو عشاق کا شیوہ ہی نہیں
لب پہ جب آئے فغاں نعت لکھی جاتی ہے

خواب میں حضرت تائب جو ملیں تو پوچھوں
کس طرح شستہ، رواں نعت لکھی جاتی ہے

حرف کاری کا ہنر ان کی عطا ہے سرور
مجھ نکمے سے کہاں نعت لکھی جاتی ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

بشر کو شر سے نِکالا حضورؐ نے آ کر
کِیا ہے پست کو بالا حضورؐ نے آ کر

ہر ایک سمت ہی ظُلمت تھی، تیرگی تھی یہاں
کِیا جہاں میں اُجالا حضورؐ نے آ کر

جو ڈگمگاتی رہی ہے، وہ دِل کی ناؤ تھی
بھنور سے اُس کو نِکالا حضورؐ نے آ کر

تمام خلق تھی مصروف بُت پرستی میں
خُدا کے دیں کو سنبھالا حضورؐ نے آ کر

جو راہِ حق تھی، جو وحدت کی راہ تھی، ہم کو
اُس ایک راہ پہ ڈالا حضورؐ نے آ کر

سبُو تمام تھے خالی مئے محبت سے
بھرا ہے پیار سے پیالا حضورؐ نے آ کر

بُہت سی رسمیں جہالت کی اِنتہا پر تھیں
کِیا ہے جن کا اِزالہ حضورؐ نے آ کر

بتایا فرق حرام و حلال میں کیفی!
کِیا یہ کام نِرالا حضورؐ نے آ کر

محمود کیفی

عقیدت

مرے نبی سا کوئی باکمال ہے ہی نہیں
مرے حضور کا برجِ زوال ہے ہی نہیں

میں کہہ رہا ہوں کہ اُن سا کہیں نہیں کوئی
میں کہہ رہا ہوں کہ اُن کی مثال ہے ہی نہیں

جہاں نے آپ سا شیریں بیاں نہیں دیکھا
بجا ہے آپ سا شیریں مقال ہے ہی نہیں

اسے دکھایئے آیت مباہلہ والی
وہ کہہ رہا ہے محمد کی آل ہے ہی نہیں

میں ان سے کوئی تعلق نبھا نہیں سکتا
جنھیں حضور کے گھر کا خیال ہے ہی نہیں

انصر حسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آپؐ کی آنکھوں کا مرکز ہو، آپؐ کا مداح نگار
بار بھی آپؐ کے در تک پائے ایک سپاس سپار

عقیدت

میرے آقا کی ہر اک انوکھی ادا
ہر ادا پر دل و جاں کروڑوں فدا
وہ مدینہ کہ جس کے تھے فرماں روا
آج وہ کحلِ چشمِ زمانہ ہوا

امن و تہذیب کی اولیں درس گاہ
تھے معلم جہاں کے شہ انبیا
ہم شہ انبیا کی کریں کیا ثنا
ان کے قدموں کی ہیں دھول ارض وسما

اس مدینے کی گلیاں ہیں جنت نشاں
جس پہ رہتی ہے رحمت سدا پر فشاں
کاش اپنا بھی ہو اک وہاں آشیاں
ہم سے عاصی بھلا اس کے قابل کہاں

خیر آقا جو چاہیں تو کیا بات ہے
رحمتِ دو جہاں آپ کی ذات ہے

وہ مدینہ کہ جس کے تھے آپ حکمراں
جن سا اب تک جہاں میں ہوا ہی نہیں
خاتم الانبیا، حسنِ جود و سخا
ان سا حاکم کوئی بھی کہیں بھی نہیں

آ رہی ہے ہر اک سمت سے یہ صدا
رہبر و رہنما، مصطفیٰ! مصطفیٰ!
جن کے ہوں آپ ہی رہبر و رہنما
ان کو اوروں کی ہوگی ضرورت ہی کیا

وہ بنے تھے امام، انبیا مقتدی
ان کی خاطر ہوئی زندگی زندگی
وہ ہمیشہ جنہیں فکرِ امت رہی
جو پکاریں سدا امتی امتی
ہے نصیبوں کی بات اُن کی امت میں ہیں
رحمتوں کے سمندر کی رحمت میں ہیں

راجہ عبدالقیوم

مدینہ جانِ حرم

حرم کا دل ہے مدینہ، مدینہ جانِ حرم
مدینہ رونقِ کعبہ، مدینہ شانِ حرم
حرم میں ہیں جہاں مہمان سارے اللہ کے
وہاں دراصل مدینہ ہے میزبانِ حرم
گھر اس کا مکہ میں ہے اور در مدینے میں
تو جاؤں میں کہاں پہلے؟ بتا گمانِ حرم
جو دیکھیے تو حرم ہے زمیں مدینے کی
جو سوچیے تو مدینہ ہے آسمان حرم
وہ تاجدارِ مدینہ کے اک غلام کی ہے
جو بامِ کعبہ پہ گونجی تھی اک اذانِ حرم
ہر اک فسانے سے بڑھ کے نہ کیوں ہو دلکش وہ
بنی ہے حرفِ مدینہ سے داستانِ حرم
طواف و سعی سے بھی دل پہ جو نہیں کھلتا
عیاں مدینے میں ہوتا ہے وہ نہانِ حرم
وہ آفتاب جو ام القریٰ سے چمکا تھا
وہ آج بھی ہے مدینے سے ضوفشانِ حرم
خدا کے گھر میں بھی بیٹھے تھے جو خدا بن کے
مدینے والے نے توڑے ہیں وہ بتانِ حرم
یہ حج و عمرہ غذا ہیں جو روح کی، دل کی
مدینے ہی سے ملے ہیں یہ آب و نانِ حرم
یہ زمزم از رہِ دستور پیتے ہیں ورنہ
خمِ مدینہ کے پیاسے ہیں تشنگانِ حرم
مدینے جا کے بنا وہ یقیں حضوری کا
میں اپنے ساتھ جو لے کر چلا گمانِ حرم
کہاں برستے جماروں پہ تیر پتھر کے
اگر نہ ملتی مدینہ سے یہ کمانِ حرم
مناسکِ عرفات و منیٰ و مزدلفہ
ہیں سب مدینے کے دفتر یہ این و آنِ حرم
سرزباں یونہی "لبیک لاشریک" نہیں
زباں کو دی ہے مدینے نے یہ زبانِ حرم
وہی ہے مکہ میں حق جو ملے مدینے سے
ہے باریابِ مدینہ ہی کامرانِ حرم
عبادت اپنی جگہ، عشق کی نگاہوں میں
جہاں جہاں ہے مدینہ، وہیں جہانِ حرم
وہی صراطِ عبادت ہے مستقیم، آصف!
چلے ہیں جس پہ مدینے سے رہ روانِ حرم

مرزا آصف رسول

رباعیات

جانے کیا پھونک کر فسوں آتی ہے
ہر روز نیا کر کے جنوں آتی ہے
ایوان سے آ رہی ہے مقتل کی صدا
دربارِ شہی سے بُوئے خوں آتی ہے

دنیا کہ سمٹتی ہی چلی جاتی ہے
رشتوں کی تڑپ کس کو تڑپاتی ہے
صدیوں کی خامشی ہے اپنوں کو محیط
موجود میں محشر کی صدا آتی ہے

اتنی بھی نہ کر حکایتِ شوق دراز
تارِ رگِ جاں سے جل اُٹھے نغمۂ ساز
آنسو ٹپکیں تو جسم و جاں جلنے لگیں
سانسیں ٹوٹیں تو ٹوٹ جائے آواز

دھوکا ہے، سراب ہے، سزا ہے، کیا ہے؟
آئینہ ہے سامنے، خفا ہے، کیا ہے؟
خود پر ہی بار بار پڑتی ہے نظر
میں ہوں، تُو ہے، کوئی یا ہے، کیا ہے؟

کانٹوں کے بدن سے تازگی لیتے ہیں
پانی جو نہیں، سراب پی لیتے ہیں
ہر روز جو تیرا غم ہمیں مارتا ہے
ہر روز نشاطِ غم سے جی لیتے ہیں

مشرق کے بدن سے کیا سحر اُتری ہے
کرنوں کے جلو میں غم کی ظلمت بھی ہے
وہ دیکھ پھر آج صبح کے ماتھے پر
سورج ابھرا، ہَوا نے سسکی لی ہے

سورج ہے عجیب، کچھ اُجالا کر کے
اک اگلی صبح کا تقاضا کر کے
ہر رات ستاروں کو بجھا دیتا ہے
ہر روز نکلتا ہے تماشا کر کے

خالد علیم

ہائیکو (بوسن)

Wisps of my hair
Quiver together with the plumes
of the pumpas grass

میرے چاندی بال
لہرائے جن سے مِل کر
کلغی والی گھاس

Someone is living there;
Smoke leaks through the walls
In the spring rain.

کوئی رہتا ہے
دیواروں سے اُٹھتا دھواں
کچھ تو کہتا ہے

In every village,
Sleep grows deeper;
falling water

گاؤں کی دمساز
گہری نیند کے عالم میں
جھرنوں کی آواز

You going away,___
How long the road !
How green the willows

روٹھ گیا ہے بخت
لمبی فرقت کی شہراہ
پیچھے سبز درخت

The May rains;
Even a nameless stream
Is a thing of dread.

بارش مئی کی
اندیشوں سے ہیں لبریز
لہریں لئی کی

ترجم: خاور اعجاز

ماہیے

جذبات کا دریا ہے
وصل کے موسم میں __ ہمدم نے پکارا ہے

.....

برسات کے میلے میں
مل کر ہم دونوں __ بھیگیں کے اکیلے میں

.....

جینا بھی دُوبھر ہو
خدشہ رہتا ہے __ دوری نہ مقدّر ہو

.....

حالات کی گھاتیں ہیں
کچھ بھی تو بس میں نہیں __ تقدیر کی باتیں ہیں

.....

ایذائیں سہتے ہیں
اُن کے تغافل پر __ ہم کُڑھتے رہتے ہیں

.....

کچھ کھاتے کھولے ہیں
صبر ہی کرتے رہے __ تنگ آ کر بولے ہیں

.....

وحشت کا عالم ہے
اخراجات بہت __ تنخواہ بہت کم ہے

.....

گمراہ زمانہ ہے
حُسن کے حربوں سے __ ایمان بچانا ہے

ممتاز راشد لاہوری

گیت

چاند تجھے کیسا لگتا ہے
اپنے سندر چہرے جیسا
یا مجھ سا تنہا لگتا ہے

چاند تجھے کیسا لگتا ہے
رنگوں کرنوں کا دلدادا
رات کی رانی کا شہزادہ
سج دھج میں پیارا لگتا ہے

چاند تجھے کیسا لگتا ہے
چرخ پہ گھومے مارا مارا
جانے کون سی بازی ہارا
اندر سے ٹوٹا لگتا ہے

چاند تجھے کیسا لگتا ہے
دن میں سوئے رات کو جاگے
سوتن جانے جوتن لاگے
کیوں الجھا الجھا لگتا ہے

چاند تجھے کیسا لگتا ہے
غم کوئی اس نے پالا ہوگا
کسی کا چاہنے والا ہوگا
چاہت کا رسیا لگتا ہے

چاند تجھے کیسا لگتا ہے
کمی ہے کیا اس کے جینے میں
داغ سا لگتا ہے سینے میں
کچھ کھویا کھویا لگتا ہے

چاند تجھے کیسا لگتا ہے

گلزار بخاری

کاٹھ کباڑ

بے جہت سفر سے تو قید مقام بہتر ہے حقیقی کامیابی کا سفر کیسے شروع ہو کیسے طے ہو۔ اور منزل کیسے ملے؟ دل کا شیشہ صاف ہوگا تو یہ سفر شروع ہوگا اب دل کا کاٹھ کباڑ کیسے دور ہو دل کا زنگ کیسے اترے اس کے اندر سے دنیا کا کیچڑ کیسے صاف ہو؟ اس کے چند طریقے ہمارے باباجی بتایا کرتے تھے کہا کرتے تھے زندگی ایک ایسا معجزہ ہے جسے ہمیں حقیقت ثابت کرنا ہوگا ممکن ہمیشہ زیادہ ہوتے ہیں ناممکن کم بہت ہی کم ہوتے ہیں اسی لیے دل کا شیشہ صاف کرنا مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔

بہت سے صاحب دل دوستوں سے سنا کہ اس کے لیے سب سے پہلے تو ہمیں 99 کے چکر سے نکلنا ہوگا۔ رزق تو بہ قدر مقدر ملے گا ہی گن گن کر مال جمع کرنے سے اسکی محبت دل میں در آتی ہے پھر ایسے دل سے محبت منعکس نہیں ہوسکتی دل سے خواہشات اور آرزوں کے امنگوں کے بت نکال دو۔ رب کی طرف جانے والا راستہ ہی کامیابی کا ہے اور یہ بندے سے ہو کر گزرتا ہے کسی مفلس کی در پردہ مدد سے یہ سفر بڑی ہی آسانی سے طے ہوسکتا ہے حتی کہ کسی جانور پر رحم سے یا اس کے علاج سے بھی ایسا ہونا جلد ممکن ہوتا ہے اللہ کے کسی سچے دوست سے جا ملیں اور پوچھیں وہ مالک کیسے راضی ہوتا ہے۔ ماں اور باپ دونوں یا دونوں میں سے ایک سیدھی بات کریں یا الٹی مان لیں دن روشن ہو اور وہ کہیں کہ رات ہے تو برملا کہیں کہ ہاں رات ہی ہے! اپنے دل میں اندھیرا ہو تو کسی ایسے دل کی تلاش کریں جس میں روشنی ہو اس کی صحبت اختیار کرلیں تو ہزار کتابوں سے افضل ہے سب کچھ رب کی رضا کے لیے کریں پھر بھی اپنی کوتاہی کو سامنے رکھ کر رحم کی درخواست ہو کہ جیسا عمل رب کریم کی شایان شان تھا وہ ہم سے نہ ہوسکا کسی بھی وقت یا دوستوں کی محفل میں یونہی مزہ لے کر جو ہم

سلیمان عبداللہ ڈار

نے غیبت کی تو دراصل ہم نے اپنی مقبول نمازیں روزے جو بھوک اور پیاس کی شدت میں رکھے تھے جو دھیان سے تلاوت کی تھی اس بھائی کو دے دیئے جس کی چغلی کر رہے تھے کوئی بھی انسان گھٹیا نہیں ہوتا کسی کو کم تر خیال نہ کریں بدترین دشمن کو بھی معاف کردیں تو رب ذوالجلال ہمیں بھی معاف کر دیں گے اپنے دشمن کو بھی معاف کر دیں اور اسے حقیر نہ سمجھیں کہ اور کچھ دن یا اور کچھ سال تک ہم بھی اور وہ بھی منوں مٹی تلے ہوں گے یعنی میں اور میرا دشمن دونوں ہی بے وقعت بے حیثیت اور بے قیمت ہو جائیں گے تو پھر جھگڑا کیسا؟ اور جھگڑا کس لیے؟ دل کے آزار کو دل کی تکالیف کو حل کرنا ہوگا لوگوں کے ساتھ موازنہ نہ کریں تو ہم کبھی رنجیدہ نہ ہونگے۔ ہمارے ساتھ والی دکان پر زیادہ گاہک آتے ہیں یا ہمارا پڑوسی ہم سے کہیں زیادہ (دنیا کے اعتبار سے) صاحب حیثیت ہے تو مغموم نہ ہوں کہ یہ زندگی عارضی ہے وہ بھی مسافر ہم بھی مسافر تو مال دولت اور ملکیت کے جھگڑے کیسے ہم سب اگر یہ سوچ اپنا لیں تو کچہریاں اور تھانے ویران ہو جائیں ہم کچھ نہ کچھ آگے بھیجیں گے تو اگلے جہان جانے کو جی چاہے گا ورنہ تو یہ جان مکان دکان کا رنز پلاٹ اور پلازے میں اٹکی رہے گی اور جانے کی گھڑی آجائے گی پھر حسرت ہی حسرت ہوگی طویل آرزوؤں سے بچیں گے تو دل کو آسانی ہو گی بعد میں آنے والوں کے لئے مال اکٹھا کر کے اور جائیداد بنا کر چلے بھی جائیں گے تو اس میں مجھے یا آپ کو کیا فائدہ یا نفع مل سکتا ہے سوائے اک بے نام مشقت کے یا غیر ضروری محنت کے بس ضرورتیں پوری ہو جائیں تو الحمدللہ ضرورتوں کو مقاصد نہ بنائیں تو دل مسرور رہے گا ساتھ تو عمل جائے گا اللے تلے تو نہیں جائیں گے ندامت سب سے بڑا توشہ ہے ندامت ساتھ لے گئے تو موت کے بعد والی زندگی کی سب سے بڑی کرنسی ہمارے پاس ہوگی۔ دل کے اندر موجزن یہ کاٹھ کباڑ نکالنے کی کوشش کریں تو رب کی محبت اس میں آ کر سما سکتی ہے کہ یہی حقیقی محبت ہی ہمیں مرکوز کرتی ہے اور زندگی کی دقتوں اور حادثات میں منتشر ہونے سے بچاتی ہے یہی دل وجاں کا گند منہ صاف کر کے ستھرا بناتی ہے یہی دل میں رچ بس جائے تو دل دھڑکاتی ہے یہی آنکھوں میں حیا پیدا کرتی ہے یہی قرب پیدا بھی کرتی ہے پھر قرب کو بڑھاتی بھی ہے یہی عاجزی پیدا کرتی ہے یہی تن من دھن وارنے اور قربان کرنے پر اکساتی ہے اسے نفرتوں کی ہوا بھی لگ گئی تو محبتیں تقویٰ پرہیزگاری شب بیداری قیام الیل اور رکوع سجود سب کچھ بے سود ہو جائے گا محبت بھرے برتن کے پیندے میں نفرت کا سوراخ ہو گیا تو تعلق والا میٹھا پانی محبت کے اس برتن کو بھرنے سے ہمیشہ قاصر رہے گا رب کریم کتنی اور کیسی محبت کرنے والے ہیں کہ فرمایا بنی آدم اجک کیسا احسان کیا کیسا انعام کیا کہ یہ نہیں فرمایا اے ایمان والو

کیسی فراخ دلی ہے کہ شہنشاہوں کا شہنشاہ فرما رہا ہے۔ اے آدم کے بیٹے! میں تم سے محبت کرتا ہوں کیا تو میرا حق مجھے نہیں دے گا؟ کہ تو بھی مجھ سے محبت کر!

ذرا سوچئے کہ آدم کے بیٹوں میں تو سکھ اور ہندو بھی آتے ہیں جو ایمان ہی نہیں لائے اس میں تو ملحدین بھی آتے ہیں کہ وہ اس محبت کرنے والے رب ہی کا انکار کرتے ہیں اس میں تو عیسائی بھی آتے ہیں جنھوں نے رب کی ربوبیت میں حضرت عیسیٰ کو شامل کر کے شرک کیا اس میں تو نصرانی اور یہودی بھی آتے ہیں جنھوں نے حضرت عزیرؑ کو رب کا بیٹا کہا مگر اے رب کریم تیرے صدقے جائیں تیری یہ کیسی بے لوث محبت ہے یہ چاہت کی فراوانی کے کیسے بادل ہیں جو ایمان والوں پر تو برس ہی رہے ہیں مگر بے ایمانوں اور نہ ماننے والوں سرکشوں پر بھی اسی مہربانی اور اپنائیت سے برستے ہیں یہ کیسا بڑا پن ہے جس کی اس کائنات یا کائناتوں میں مثال نہیں ملتی پھر جس الفت سے یہ فرمایا کہ اے آدم کے بیٹے تجھ پر تو میرا حق ہے کیا تو مجھ سے محبت نہیں کرے گا؟ تو یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے اپنے عزیز و اقارب کو احباب کو رشتہ داروں کو یا دوستوں سے کہا جاتا ہے کہ تو تو اپنا ہے تجھ سے تو بڑے مان سمان سے بات ہو سکتی ہے رب بالکل ویسے ہی لہجے میں کہہ رہا ہے۔

،، تو مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتا،،

یہ کیسا پیار ہے یہ کیسا بڑا پن ہے۔ یہ کیسا اعزاز و اکرام ہے اور اگر اس اعزاز و اکرام پر بھی بندہ رب سے دور جائے تو کیا یہ رب کی محبت کی بے اکرامی اور بے قدری نہیں؟ پھر محبت سے فرمایا تو مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتا اب اگر میں اس بات کا اپنے پیارے مالک کو محبت بھرا جواب دینا چاہوں تو وہ یہی ہو گا کہ اے اللہ میں بھی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے تجھے چاہتا ہوں اور میں یہ اپنے عمل سے ثابت کروں گا۔

یعنی

* تجھے یاد کرنے میں زیادہ وقت گزاروں گا۔
* تو پانچ وقت اپنے گھر بلاتا ہے میں کوشش کروں گا کہ اس بلاوے پر تیرے گھر ضرور حاضری دوں
*تو نے مجھے پیار بھرا خط لکھا یعنی قرآن مجید اپنے بندے کے لیے بھیجا مجھ سے معاذ اللہ اس کی بے توقیری ہوئی میں نے اسے سر پر اٹھا کر قسم تو کھالی مگر اس کے مطابق زندگی کو گزارنے کی کوشش نہ کی یا اس میں کمی رہ گئی جواب نہ رہے گی۔
* میں اب بدنظری سے بچنے کی کوشش کروں گا۔
*میں اگر تاجر ہوں تو ملاوٹ یا ذخیرہ اندوزی نہیں کروں گا اگر مقرر شعلہ بیاں ہوں تو چند ٹکوں کی خاطر فرقہ واریت نہیں پھیلاؤں گا اگر وکیل ہوں تو بے گناہ کو پھانسی نہیں دلواؤں گا اگر مزدور ہوں تو اپنی دیہاڑی ایمانداری سے کروں گا ریڑھی والا ہوں تو پورے دام لے کر گاھک کو گلا سڑا پھل نہیں دوں گا۔

اسی طرح رب کریم کی محبت بھری آفر کا الفت

بھرا عملی جواب دل کے اندر والے کاٹھ کباڑ کو صاف کر کے دیا تو جا ہی سکتا ہے اگر چاہیں تو؟ اب اس مرحلے پر اک عجیب بات ہو جاتی ہے کہ دل کا گند مند صاف کرنا چاہتے ہیں مگر کر نہیں پاتے رب کو راضی کرنا چاہتے مگر اپنی انا راستے کا پتھر نہیں پہاڑ بن جاتی ہے میں اپنے پیارے قارئین سے اک محبت بھرا سوال کرنا چاہتا ہوں۔

،، کہا کبھی آپ نے اپنے ساتھ بھی کچھ وقت گزارا؟

،، کیا کبھی خود سے بھی کوئی بات کی؟

اگر ایسا ہے یا ہوتا رہتا ہے تو پھر آپ اپنے آپ پر حکومت کر سکتے ہیں میں تو اکثر اکیلا بیٹھ کر دل ہی دل میں خود سے کہتا ہوں اور کہتا رہتا ہوں۔

ہائے ہم نے اور ہر کسی سے دل کی بات کی رب سے کبھی نہیں کی!

کبھی دعائے نیم شب میں مصلے پر ہلکی ہلکی سی سسکیاں سرگوشیاں دل کے نہاں خانوں سے اٹھنے والی باتیں کبھی ایسی باتیں کی ہوں کبھی اسے اپنا بنایا ہو کبھی اسے اپنا سب کچھ سونپ دیا ہو کبھی اپنا آپ اس کے ہاں رہن رکھ دیا ہو کبھی اسے کہا ہو ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھا کیا کبھی کوئی اپنی خاص عادت یا دلچسپی اس کی محبت پر قربان کی ہو یعنی چھوڑ دی ہو کبھی اس کے لیے دو عالم سے خفا ہوئے ہوں کبھی اس کی رضا پر راضی رہے ہوں کبھی اس کی شکایت کرنے سے باز رہے ہوں۔ کبھی اس کا گلہ کرنے پر شرمندہ ہوئے ہوں مال سے محبت کے باوجود کبھی اس کی چاہ میں بے دریغ مال صدقہ کیا ہو۔ کبھی صرف اس کی ذاتی خوشی کے لیے کسی مسکین کو کھانا کھلایا ہو کبھی صرف اور صرف اس کی رضا کے لیے دوستوں اور رشتہ داروں کا غلط سلوک اور گالیاں برداشت کی ہوں کبھی اس کی پسند پر اپنی ذاتی پسند کو چھوڑا ہو اگر بدنظری میں اک مزا ہے تو کبھی اس مالک کی خوشی کے لیے بدنظری ترک کی ہو کہ اس میں اس سے بھی زیادہ مزا ہے کبھی اسے اپنا سب کچھ سونپ دیا ہو کبھی اس طرح سے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی سنت ادا کی ہو اگر ایسا ہو تو پھر اس کا سلام آ جایا کرتا ہے جو ذاتی اللہ ہے اس موقع پر سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پوچھا تھا

،، کیا میرا نام لے کر رب کریم نے سلام بھیجا،، تو سرکار دو عالم نے فرمایا۔ ،ہاں جبرائیلؑ نے مجھے یہی بتایا کہ آپؓ نام لے کر سلام بھی بھیجا اور پوچھا ہے کہ کیا صدیقؓ اس حال میں اپنے رب سے راضی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہی ہے کہ اللہ نے حضرت صدیق اکبر کا ایک پرانا مسئلہ بھی حل کر دیا ہے۔ سرکار دو عالم نے پوچھا ' کیا مسئلہ تھا' تو جواب دیا سالہا سال سے داڑھ میں درد تھا میں بھی حیران کہ آج صبح سے یہ درد نہیں ہوا۔ آپؐ نے فرمایا' مجھے کبھی بتایا تو نہیں' عرض کیا' شرم آتی تھی کہ اپنے مہربان رب کا شکوہ کیوں کروں۔

محبت کرنے والے یار غار نے تو پھر یہی کہا

ہو گا راضی کیا ہیں بہت ہی راضی ہیں خوشیوں کے شادیانے بجائے ہونگے انسانیت کی اس سے بڑی معراج اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ محبوب حقیقی خود سلام بھیجے اور خود راضی ہونے کا پوچھے مگر بندے کو اس کے لیے پہلے خود اپنا دل صاف کرنا ہو گا اپنا سب کچھ رب پر وارنا ہو گا قربانی نہیں قربانیاں دینا ہونگی پھر قربانیاں دینے والوں میں سے جو افضل ہوتا ہے وہ صدیقؓ کہلاتا ہے پھر اسے سلام بھی آتا ہے۔

انسان کو رب سے پیار ہو جائے تو یہی اسکی معراج ہے پھر گناہوں میں لتھڑے ہوئے بندے کو بھی وہ اپنا بنالے گا اور اپنا بن جائے گا ساری دنیا کو جس سے لگن آئے مالک اس کے دل کو دیکھے گا اگر اس میں سے دنیا کا گند نکل چکا ہے تو وہ اس دل میں سما جائے گا دنیا بے شک ظاہری حالت سے نفرت کر لے رب نفرت نہیں کرے گا کہ وہ باہر کو نہیں اندر کو دیکھتا ہے جس کا اندر بنا ہوا ہے وہی اس کا سچا دوست ہے کیا ہم نے کبھی اپنے دل میں جھانک کر دیکھا؟ وہاں چاہے خطاؤں کے سمندر موجزن ہوں۔

مگر ان سمندروں میں دور کہیں نہ کہیں اللہ کو راضی کرنے والی چاہت کا الفت کا محبت کا اک جزیرہ ضرور موجود ہو گا جو گناہوں لغزشوں اور کوتاہیوں کے تھپیڑے مارتے سمندر کو خاطر میں نہیں لاتا ہو گا۔

یہ چھوٹا سا پیار بھرا من موہنا سا من بھاؤنا سا بہت ہی کیوٹ سا محبت بھرا جزیرا دل کے سمندر میں اسی وقت ابھرے گا جب یہاں سے دنیا اور دنیا داری کی محبت کا کاٹھ کباڑ کرپشن نخوت غرور اور تکبر کا گند فراڈ دھوکہ بازی ناجائز منافع خوری کا کچرا صاف ہو۔

میں نے اپنی استطاعت کے مطابق اپنے دل میں اور اپنے پیارے قارئین کے دل میں ایسے ہی کسی دور دراز موجود چھوٹے سے جزیرے کے کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے میں نے بہت سوچا پڑھا دل مطالعہ کیا تو یہی پایا۔

،،رب سے کبھی کسی نے دکھ نہیں پایا
ہمیشہ سکھ پایا ہے،،

پرستش سکھ دیتی ہے چھوٹائی سکھاتی ہے دراصل چھوٹائی ہی سیکھنے کی چیز ہے تکبر تو خود بخود دل میں در آتا ہے یہی تو کاٹھ کباڑ ہے۔ یہ دل سے نکل گیا تو محبت خود بخود اپنا آپ منوالے گی یہ مجازی ہو تو بس ایک سیڑھی ہے جو مجھے یا آپ کو عشق حقیقی کی بلندیوں پر لے جائے گی یا اس میں معاون ثابت ہو گی پھر جب آپ اس راستے پر چلیں گے اور کسی دن اپنے دل کو صاف کر کے عشق حقیقی کی چاہ میں چپکے چپکے اپنے دل کی بات اپنے رب سے کریں گے دل سے پوچھیں گے کہ اس چاہ کی راہ میں کیا ملا تو دل کہے گا۔

میں ریگزار زیست پہ تنہا سفر میں تھا
منزل سے میری اس نے مجھے آشنا کیا

☆☆☆☆☆

خالد احمد کے نعتیہ مجموعے

"تشبیب" کا فکری، اکتشافی و عددی مطالعہ

قصائد پر مشتمل خالد احمد کا مجموعہ تشبیب جو 1984 میں شائع ہوا، قصائد کے اس مجموعے پر بہت کچھ لکھا گیا، مگر محترمہ سیدہ آیت گیلانی نے جس قدر باریک بینی اور دانش مندی سے اس مجموعہ کلام پر اظہارِ خیال کیا وہ یقینی طور پر قابل ستائش ہے۔ ہم سیدہ آیت گیلانی کے اس طویل فکری، اکتشافی اور عددی تجزیے کو قسطوں میں شائع کریں گے تا کہ ادب کے عام قاری تک بھی یہ تنقیدی جائزہ پہنچ سکے۔ [ادارہ]

(قسط # 5)

ہر حمد خالق اکبر ﷻ کے لیے جس کی
چاہت کی مجسم تصویر کا نام مصطفیٰ ﷺ ہے
اور درود سلام احمد مجتبیٰؐ خیر الوریٰؐ کے لیے
جن کی وِلا کنزِ ایماں کا سرمایۂ کل ہے۔

اے ربِ ساعت!
اے صبح کے پروردگار!
اے بیدل کے دل کی جاں
اے اردۂ کُن کی شاں
اے ازل پہ ازل سے مہرباں
اے ابد کے بعد بھی ابد پہ حکمراں
تُو کہاں اور میں کہاں

سیدہ آیت گیلانی

نہیں مجال کہ پا سکیں
تیری رمز، یہ کون و مکاں
میں ہو کر بھی کہیں نہیں
تُو ہر جا، یہاں وہاں
مجھے اپنی خبر نہیں
تُو کنزاً خفیاً کا ترجماں
کر قبول میری نوائے شوق
میں مٹا ہوا اک حرف وہم
تو حقیقتِ وجود یزداں

======

''تجلیٔ حقیقت''

چونکہ ہمارا مقصود ''تجلیٔ حقیقتِ محمدیہ'' کی طلب ہے اس لے علم و عرفان کے طُور تک سفر لازم ہے اور یہ سفر اس امر کا متقاضی ہے کہ بحرِ برہان کی ہر لہر میں ڈوب کر یوں ابھرا جائے کہ ہر قطرہ حقیقت کا ترجمان بن کر بدنِ قرطاس پہ بصورت گوہرِ آبدار سج جائے۔

----------اس حقیقت سے انکار ممکن ہی نہیں کہ ''دلیل'' کبھی تنہا نہیں ہوتی ہمیشہ دعوے کے ساتھ ہوتی ہے۔یوں کہہ لیجیے کہ دلیل کی نسبت دعوے سے ازلی و ابدی ہے۔یہ جہاں بھی ہوں گے سدا ساتھ ساتھ ملیں گے۔دعویٰ بیان کی صورت ہو یا الفاظ کی صورت ایک اطلاع ہوتا ہے درحقیقت دعویٰ نادیدہ ہوتا ہے۔نہ ہی یہ کسی لباسِ وجود میں سامنے آتا ہے نہ ہی نقش و نگار سے خود کو عیاں کرتا ہے۔آواز یا لفظ اس کا اعلانیہ ہیں فقط دلیل ہے جو اس کے وجود کی صداقت کو ثابت کر کے منواتی بھی ہے اور اسے ابدی حیات بھی عطا کرتی ہے۔یہاں لفظ ''ابدی حیات'' سے مراد صفتِ تخلیق کی مرہونِ منت موت سے جڑی زندگی ہرگز نہیں ہے۔دعویٰ کی حیثیت ہمیشہ اوّل الاوّل ہوتی ہے کیونکہ جب دلیل چھپی ہوتی ہے دعویٰ تب بھی اپنے مقام پر صفت و ذات کی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ جوں کا توں قائم ہوتا ہے۔دلیل کا کام اس کو منوانا ہے۔دعویٰ مقام نہیں بدلتا یہ دلیل ہے جو اسے ہر جگہ پہنچاتی ہے۔اس کا تعارف بنتی ہے اس کی پہچان کا وسیلہ بن کر اسے متعارف کرواتی ہے۔اب دلیل جس قدر واضح اور سچی ہوگی دعویٰ اسی قدر تسلیم کیا جائے گا۔یہاں ایک اور سوال اٹھتا ہے دعویٰ جس قدر صاحبِ حیثیت ہے کیا دلیل بھی اُسی مقام و مرتبے کی مالک ہے؟ اسکے لیے ایک نظر مقدمے کو دیکھتے ہیں۔

مدعی خود خدا تھا۔اور دعویٰ اپنی پہچان کا تھا جیسا کہ حدیث قدسی سے ظاہر ہے۔فرمایا:-

کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَأَحْبَبْتُ اَنْ أُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِکَیْ أُعْرَفَ

اللہ ﷻ نے فرمایا کہ:-

"میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں تو میں نے خلقت کو خلق کیا تا کہ جانا جاؤں۔"

یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی وقت، وقت نہ تھا۔ جب وقت نہ تھا تو نہ دن تھا نہ رات۔ نہ سورج کی سج دھج نہ چاند کی چاندنی نہ تاروں کی بارات ۔ ہوائیں گم تھیں فضائیں لاپتا، نہ آسماں تھا نہ زمیں۔ نہ ماہ نہ مہ جبیں، نہ کہیں حُسن تھا نہ کوئی حسیں۔ نہ بادل کا کڑکا نہ لپکتی بجلی، نہ برسات نہ سوغات، نہ گل تھا نہ بلبل، نہ چہک نہ چمک، نہ مہک نہ دمک، نہ آب نہ آبشار، نہ دمن نہ کہسار، نہ ندی نہ اشجار، نہ سواری نہ سوار نہ جذبہ نہ اظہار، نہ لوح نہ قلم نہ قلم کار، نہ فن نہ فنکار کچھ نہ تھا اس کی کبریائی تھی اور کبریائی کی اس تنہائی میں اس کی بادشاہی تھی وہ ہی وہ تھا جو ازل سے پہلے بھی اللہ ﷻ تھا ابد کے بھی اللہ ﷻ اس عالم میں رہتے ہوئے وہ چھپے تھا اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے مالک زمان و مکان فرما رہا ہے کہ میں چھپا ہوا نایاب خزانہ تھا۔ پھر میں نے چاہا کہ کوئی ہو جو میری ذات و صفات کا ادراک کرتے ہوئے میری حمد کرے، کوئی ہو جو اقرار کرے، اعلان کرے کہ اللہ ﷻ ہے، اور اللہ ﷻ ہے تو کیسا ہے۔۔۔ اسی بات کو موضوع بناتے ہوئے مولوی "اشرف علی تھانوی" اپنی کتاب "البدائع" میں رقمطراز ہیں کہ:-

"اللہ ﷻ جمیل ہے اور جمال مقتضی ہوتا ہے ظہور کا۔ یعنی ظہور اس کے لیے مناسب ہے۔

اللہ ﷻ حکیم ہے اس امر کی رعایت سے با اختیار مخلوق کو پیدا فرمایا جن سے اپنے افعال کا اور ان کے واسطے سے اپنی صفات کا اور اپنی ذات کا ظہور فرمایا"۔

رہبر خمینیؒ اپنی کتاب "چہل حدیث" کے صفحہ نمبر 770 پر ایک روایت درج ہے کہ انسؓ بن مالک نے فرزند رسولؐ حضرت امام رضا علیہ السلام سے پوچھا کہ:-

"اے فرزند رسولؐ!! جب کوئی شے پیدا نہیں ہوئی تھی تو کیا جب اللہ ﷻ اپنی ذات سے آگاہ تھا؟"

امام عالی مقام نے فرمایا "بیشک تھا"۔

انسؓ بن مالک نے پھر سوال کیا

"یا امام علیہ السلام!! اگر وہ ﷻ اپنی ذات سے آگاہ تھا تو وہ ﷻ خود کو دیکھتا بھی ہوگا اور سنتا بھی ہوگا؟"

امام علیہ السلام نے فرمایا:-

"اے انس!! اس کی ذات عین ذات تھی۔ اسے کسی کی ضرورت نہ تھی۔ نہ کوئی سوال کرنے والا تھا نہ اسے اس کی خواہش تھی۔ اس کی ذات وہی تھی، وہی ذات تھا۔ ہر شے پہ اس کا غلبہ، ہر طرف اس کی حکومت اور ہر سو اس کی قدرت غالب تھی اس وقت اس نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔"

"میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا"

حدیث قدسی کا یہ ٹکڑا ایک راز کی طرح ضو دکھاتا ہے کیونکہ جب وہ تھا تو کوئی چیز تو تھی نہیں جس میں وہ چھپا ہو اور نہ ہی کوئی ایسی چیز ہے جس میں وہ چھپایا جائے۔ تو اس کا ترجمہ اگر ہم یوں کریں کہ اللہ ﷻ کہہ رہا ہے کہ "میں اپنی ذات میں مخفی تھا کہ میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے ایک مخلوق کو خلق کیا"

اب یہاں پہلے یہ جان لیں کہ اللہ ﷻ کب سے ہے کیونکہ وہ جب سے ہے تب سے اس کی مشیت ہے۔

کتاب "سوال امام کے جواب امامؑ کے"--- میں درج ہے کہ:۔

ابوبصیر روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا:

اے ابوجعفرؑ! مجھے بتایئے کہ تیرا رب کب سے تھا؟

آپ نے فرمایا: افسوس ہے تم پر جو چیز کبھی موجود نہ ہو اس کے لیے تو پوچھا جا سکتا ہے کہ کب سے ہے؟

میرا پروردگار تو ہمیشہ سے ہے، وہ کیفیت سے پاک ہونے کے باوجود زندہ ہے۔ اس کے لیے "تھا" نہیں کیونکہ یہ لفظ کیفیت پر دلالت کرتا ہے اور اس کے لیے "ہو گیا" کا لفظ بھی نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ کسی چیز کے اندر محدود نہیں، کسی چیز کے اوپر تکیہ بھی نہیں، اپنے مقام کے لیے کوئی مکان بھی پیدا نہیں کیا۔ چیزوں کو خلق کرنے کے بعد اس کی طاقت میں اضافہ ہوا اور نہ ہی مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے وہ کمزور یا ناتواں تھا۔ کسی خلق کو پیدا کرنے سے پہلے اسے خوف تھا اور نہ ہی اپنی مخلوق سے شباہت رکھتا ہے۔ مخلوق کی خلقت سے پہلے ان پر مکمل قدرت اور تسلط رکھتا اور مخلوق کے جانے کے بعد بھی ان پر قدرت ختم نہیں ہوئی۔

مادی زندگی کے بغیر زندہ ہے۔ وہ توانا بادشاہ ہے، اشیاء کی خلقت سے پہلے اور جہان ہستی کی پیدائش کے بعد بھی طاقتور حاکم ہے۔ اس ذات کے لیے کیفیت، مکان اور حد نہیں ہے، وہ کسی شئے سے شباہت کی بناء پر پہچانا نہیں جاتا اور ہمیشہ رہنے کے باعث

بوڑھا نہیں ہوتا، وہ کسی شے سے نہیں ڈرتا اور کوئی چیز اسے ڈرا نہیں سکتی جبکہ تمام اشیاء اسی سے خائف ہیں۔ وہ زندہ ہے بغیر مادی اور حادث زندگی کے اور قابل وصف ہونے کے اور محدود کیفیت کے اور ایسے موثر اثر کے بغیر اور ایسے مکان کے بغیر کہ کسی کے ہمسائے میں ہو بلکہ ایسا زندہ ہے جو اپنے آثار قدرت کی بناء پر پہچانا گیا اور دائمی بادشاہ ہے، طاقت اور حکومت اسی کے لیے ہے۔ جسے چاہتا اپنی مشیت سے پیدا کیا اسکی نہ کوئی حد ہے نہ جزا اور نہ ہی وہ فنا ہے۔

وہ کیفیت کے بغیر اول ہے اور مکان کے بغیر آخر ہے، اس ذات کے علاوہ سب کچھ نابود ہے ہوگا۔ خلق اور حکم اسی کے ہاتھ میں ہے۔ بابرکت ہے عالمین کا پروردگار۔

اے سوال کرنے والے! تم پر افسوس ہے۔ بے شک میرے پروردگار تک خیالات کی رسائی نہیں اور شبہات اسے پا نہیں سکتے، کوئی اس کے نزدیک نہیں پہنچ سکتا اور وہ بھی کسی کا ہمسایہ نہیں۔ اسے حادثات متاثر نہیں کر سکتے۔ اس کے افعال سے متعلق نہیں پوچھا جا سکتا۔ وہ کسی پر واقع نہیں ہوتا، اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند، جو کچھ آسمانوں میں ہے یا زمین میں یا ان کے درمیان یا زمین کے نیچے ہے سب اسی کا ہے۔

جناب حق علی "اسرار الٰہیہ" (تحریر۔ دوم) میں اسی بات کی تشریح و توضیح پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:-

"اللہ ﷻ کے لیے لفظ کب تھا، کب ہے اور کب تک رہے گا نہیں بولا جائے گا کیونکہ وہ زمانے کی قید میں نہیں آتا وہ زمان و مکان کا خالق ہے بس وہ جب سے ہے اس کی مشیت اس کے ساتھ ہے اس نے اپنی مشیت کو ارادے میں بدلا اور ارادے کو امر میں اور اس سب کے درمیان فاصلہ نہیں ہے یعنی یہ بلا فصل ہیں۔

کیونکہ معاذ اللہ ایسا نہیں کہا جا سکتا کہ بس وہ اکیلا تھا، کبھی اسے خیال آیا کہ وہ پہچانا جائے پھر کہیں جا کر اس نے اس مخلوق کو خلق کیا ہوگا۔۔

عربی کا ایک قانون ہے کہ جہاں لفظ "ف" کسی جملے سے پہلے آجائے تو اس کا مطلب ہے فاصلے مٹا دینا یعنی بلا فصل ہو جانا۔

كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِياً (میں چھپا ہوا خزانہ تھا یعنی میں اپنی ذات میں مخفی تھا)

فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ یہاں جملے کے شروع میں "ف" آیا ہے یعنی وہ اپنی ذات میں مخفی تھی تو تب سے ہی اس نے یہ چاہا کہ وہ پہچانا جائے ایسا بالکل بھی نہیں کہ وہ مخفی تھا اور خود سے بے خبر تھا پھر کچھ عرصہ

بعد اس کی یہ خواہش ہوئی کہ وہ پہچانا جائے۔ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِکَی أعْرَفَ (پس اس نے اپنی پہچان کے لیے ایک مخلوق کو خلق کیا) یہاں پر بھی خلقت کے ساتھ لفظ ''ف'' آیا ہے یعنی اللہ کی ذات، اس کی مشیت اور مخلوق کے درمیان فاصلہ نہیں ہے۔ وہ جب سے ہے تب سے اسکی یہ مخلوق اس کے ساتھ ہے۔ اللہ نے اس مخلوق کو اپنی ذات پر دلیل بنایا ہے، یہ تب کی باتیں ہیں جب شے کا وجود نہیں تھا۔''

رحیم، کریم، رحمٰن صفات، صمد ذات کی چاہت، خیال اور ارادہ ہی اس کا دعویٰ تھا۔ پہچان کی چاہ طلبگار تھی کہ میں ﷻ جس جاہ و جلال، جمال و کمال، لطف و عطا، جود و کرم کا ایک لامحدود اور نہ ختم ہونے والا خزانہ ہوں، کوئی ہو جسے اس کا علم ہو، عرفان ہو، قدر ہو۔ کوئی زبان ایسی ہو جو میری قدرت کو سراہے اور سبحان اللہ کہتے ہوئے سراہتی ہی رہے، کوئی آنکھ ایسی ہو جو مجھ پر اٹھے اور ذوق نظارہ میں مخمور ہو کر میری طرف اٹھی ہی رہے، کوئی دل ایسا ہو کہ میرے حسن لازوال کو دیکھ کر ہار جائے، تجلیِ حسنِ احدیت کے سامنے وہ بے ساختہ سر جھکائے اور پھر وہ سر جھکا ہی رہے، میری عظمتوں کے اعتراف میں روح الحمدللہ کی تسبیح پڑھے اور بے خود پڑھتی ہی رہے۔ کوئی ایسا ہو جو شب کی تنہائیوں میں میرے قریب آئے، دعا کو ہاتھ اٹھائے، میرے در رحمت کو کھٹکھٹائے اور مجھ سے جھولیاں بھر بھر فیض پائے، کہیں میرے کرم کی گھٹا چھائے، کہیں میرا رحم برسے، کہیں میرے علم سے چراغاں ہو کہیں میری محبت کی داستاں ہو، اور کہیں میری ہیبت کے نشاں۔ درحقیقت یہ پہچان اور چاہت اگر ایک لفظ میں سمو دی جائے تو قدرے آسان الفاظ میں خلاصہ یہ ہوگا کہ اپنی عظمت و جلالت اور اپنے تمام اوصاف کی تجلیات کا ظہور کر کے عبد کو اپنی ذات کا عارف دیکھنا چاہتا ہے تاکہ نہ صرف عدم سے وجود میں آنے والی کائنات اور زینتِ کائنات یعنی حضرت انسان کے دل میں اس کی محبت جاگزیں ہو سکے بلکہ مقصد تخلیق جسے اس نے

''وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون''

یعنی

''میں نے جن و انس کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا''

کہہ کر بیان فرمایا اس عبادت کے قرینے سے آگاہ ہو جائے کیونکہ عبادت بنا معرفت عادت تو ہو سکتی عبادت نہیں۔

(جاری ہے۔)

ماں اور بیٹا

میں سونا چاہتا ہوں اور مجھے سردی بھی لگ رہی ہے۔

کوئی بات نہیں۔ نیند مجھے بھی آ رہی ہے۔ تم اپنے کپڑے پہن لو۔ شرارت مت کرنا۔ اچھے بیٹے بنو۔

''یہ سب کچھ ابھی کرو۔ اپنا سکارف اوڑھ لو اور ٹوپی بھی ، پاؤں میں جوتے ڈال لو تمھارے دستانے کہاں ہیں؟ سیدھے کھڑے ہو جاؤ ہلنا مت۔''

جب بچہ تیار ہو گیا تو پھر اُس کی ماں نے اُس کا بازو پکڑا اور دونوں گھر سے باہر ہو گئے۔ وہ ابھی بھی اونگھ رہا تھا۔ وہ صرف چار برس کا تھا۔ وہ چلتے ہوئے کانپ اور ڈگمگا رہا تھا، سورج ابھی نمودار ہوا تھا۔ اس وقت سرد نیلی دھند ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ماں نے بچے کی گردن کے گرد لپٹے ہوئے سکارف کے گھیرے کو مزید تنگ کیا اور ساتھ ہی اُس کے کالر کو بھی سیدھا کیا اور پھر اُس نے اُس کے نیم غنودہ رخساروں پر بوسہ ثبت کیا۔

جنگلی انگوروں، کے خشک گچھے لکڑی کی بنی ہوئی بالکونیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے باہر لٹک رہے تھے، کہ قدرے سفید برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اُس سے درجہ حرارت منفی 25 درجے پر آ چکا تھا۔ اُن کے سانس ہوا میں بھاپ کے بادل چھوڑ رہے تھے اور جو پانی بہہ کر صحن سے باہر آ گیا تھا وہ جم چکا تھا۔

''اماں ہم کہاں جا رہے ہیں''

''میں نے تمھیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ہم سیر کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔

''لیکن ساتھ یہ سوٹ کیس کس لیے؟''

اس لیے کہ اس کی ہمیں ضرورت ہے۔ بس اب خاموش ہو جاؤ۔ باتیں مت کرو۔ منہ بند رکھو۔ ورنہ ہمیں سردی آ لے گی ۔ باہر دیکھو کتنی ٹھنڈ ہے، بہتر یہی ہے کہ تم جدھر جا رہے ہو ادھر دیکھو ورنہ گر جاؤ گے۔''

مترجم: حنیف باوا

Valentin Katayev

دربان جس نے بھیڑ کی کھال جیسا کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ گیٹ سے باہر کھڑا تھا اُس نے جو ایپرن پہن رکھا تھا اُس پر ایک انعامی بیج ٹنکا ہوا تھا۔ وہ اُس سے نظریں بچا کر وہاں سے گزر گئی۔

جب وہ سامنے والی گلی میں داخل ہو گئے تو اُس نے کھڑکی کو بند کر کے اُس پر موٹی سی چٹخنی چڑھا دی۔ اُس گلی میں ہر جگہ برف ہی برف تھی۔ جو جگہ برف سے مُبرا تھی وہاں پر یا تو صاف پتھر تھا یا وہ جگہ جم کر پتھر کی مانند ہو چکی تھی۔ وہ ننگے کیکر کے پیڑوں کے نیچے سے گزرے جو دھند میں بُت بنے کھڑے تھے۔

ماں اور بیٹے کا لباس تقریباً ایک جیسا تھا انھوں نے نقلی ریشم سے بنے ہوئے کوٹ پہن رکھے تھے۔ ان کے جوتے اور دستانے چمکیلی اون سے بنے ہوئے تھے جب کہ ماں کے سر پہ دھاری دار دوپٹہ اور بیٹے کے سر پر ریشم کی گول ٹوپی تھی۔

گلی سنسان تھی۔ جب وہ چوراہے پر پہنچے تو وہاں سے لاؤڈ سپیکر کی ہلکی ٹِک ٹِک سنائی دی جس سے بچے کی ماں اندازہ لگاتے ہوئے کہنے لگی۔ غالباً یہ صبح کی نشریات کا آغاز ہونے جا رہا ہے جو مرغ کی اذان کے ساتھ ہوتا ہے۔ مرغ کی تیز آواز پوری گلی میں گونج اُٹھی جیسے کہہ رہی ہو یہ نئی صبح کا آغاز ہے۔ بچے نے لاؤڈ سپیکر کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا پھر کہنے لگا۔ ''ممّا وہاں کیا اُسے سردی نہیں لگتی۔

''نہیں۔ لیکن تم بل کیوں کھا رہے ہو۔ اُدھر دھیان دو جدھر تم جا رہے ہو۔''

لاؤڈ سپیکر کی آواز ایک بار پھر گونجی، جس نے بچوں کی سی آواز میں تین بار دوہرایا۔

گڈ مارننگ۔ گڈ مارننگ۔ گڈ مارننگ

اسی آواز نے بڑی آہنگی اور مؤدبانہ انداز سے رومی زبان میں اپنے فادر کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''فادر جو جنت میں ہے۔ کا نام بڑا معتبر ہے۔ اور اُن کی شاہی آنے والی ہے۔

فکر سے عورت نے گھبرا کر بچے کا بازو پکڑا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے دوسری گلی میں مُڑ گئی۔ ایسا بھی لگ رہا تھا جیسے وہ اُس بلند اور شیریں آواز سے پیچھا چھڑانا چاہ رہی ہو۔ جلد ہی وہ آواز خاموش ہو گئی اور اس دعا کا اختتام بھی ہو گیا۔ ہوا جو برف سے اَٹی ہوئی سمندر کی اور سے سڑک کی پگڈنڈیوں کے ساتھ ساتھ آ رہی تھی۔ ان کے سامنے گلابی دھند میں گھری آگ جل رہی تھی اور ایک جرمن دستہ اس آگ کو تاپ رہا تھا۔ وہ وہاں سے مُڑ کر دوسری جانب ہو گئی۔ اور وہ ننھا بچہ اُس عورت کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اُس کے گال سرخ ہو رہے تھے اور یخ بستہ ایک قطرہ اُس کی ناک کے نیچے آ کر ٹھہر گیا تھا۔

''ممّا کیا ہم سیر پر ہیں؟''

''ہاں بیٹا ہم سیر پر ہیں''

''مجھے اس قدر تیز سیر پسند نہیں''

''خاموشی سے میرے ساتھ چلتے رہو۔''

وہ ایک صحن میں سے گزر کر اس راستے پر چل پڑے جو کہ ایک الگ سی گلی کی جانب جا رہا تھا۔ روشنی کی آمد کی شروعات ہو چکی تھیں۔ سفیدی مائل نیلی بھاپ کے بادلوں میں سے سورج کی چمکتی ہوئی گلابی روشنی کی چمکتی ہوئی دھاری جھانکنے لگی۔ سردی میں اتنی شدت تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔ گلی میں کچھ مسافر نمودار ہوئے جو کہ ایک ہی جانب رواں دواں تھے اور لگ بھگ تمام لوگ بنڈل اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ تمام یہودی تھے جنھوں نے اپنی بستی گھیٹو میں جانا تھا۔ یہ بستی Perisyle کے قریب واقع تھی جہاں جلی ہوئی تیل کی ٹینکیاں، جو سطح سمندر پر کھڑی کسی سفری سرکس کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں کے پاس ہاتھ گاڑیاں تھیں اور کچھ لوگ برف کی گاڑیوں پر اپنا سامان لاد کر لے جا رہے تھے۔ پیدل چلنے والوں کے پاؤں سڑک سے رگڑ کھا کر آواز دے رہے تھے۔ اُس روز صبح کے وقت قصبے کے تمام حصوں سے آئے ہوئے لوگ سامان سے بھرے بنڈلوں سے لدے پھندے ہوئے ایک ہی سمت کو آہستہ آہستہ رواں تھے۔ جنھوں نے اپنی بستی گھیٹو جانا تھا۔ یہ بستی Peresy کے قریب واقع تھی۔ آنے جانے والوں کے لیے ایک راستہ چھوڑ کر باقی تمام بلاکس زنگ آلود تاروں سے گھیرے ہوئے تھے یہودی پُل کے نیچے سے گزر رہے تھے جن کے لیے چلنا محال تھا اُنھیں سٹریچر پر لے جایا جا رہا تھا۔ بہت سے لوگ موت کے منہ میں چلے گئے تھے۔ باقی بچنے والے لیمپ پوسٹ اور دیگر ایسی ہی چیزوں کا سہارا لے کر کھڑے تھے۔ ان لوگوں کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ تنہا جا رہے تھے بغیر کسی کارڈ کے۔ وہ اتنے تھے کہ جو شخص اِدھر رہ جائے گا اُسے گولی مار دی جائے گی۔ اسی لیے وہ گھروں سے نکل کر جا رہے تھے۔ ایک یہودی کو پناہ لینے کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ جو بھی گھروں میں رہ گئے تھے اُن سب کو بلا امتیاز موقع پر ہی گولیوں سے بھون دیا گیا تھا۔ شہر کی جانب سے لوگ ہاتھ گاڑیوں کو کھینچتے ہوئے جا رہے تھے اور اچھی طرح سے کپڑوں میں ملبوس بچے ایک دوسرے کے پیچھے ان کی رہنمائی میں چل رہے تھے۔ وہ سردی سے سکڑے سمٹے پیڑوں اور مکانوں کے پاس آئے تو وہاں دھواں اگلتی آگ جل رہی تھی جہاں جرمن رومانین سپاہی ان لوگوں کی جانب توجہ دیے بغیر کانوں و دستانوں سے رگڑ اور پاؤں کو زمین پر مارتے ہوئے خود کو گرم کر رہے تھے۔

دھند بڑی ہولناک تھی خاص طور پر شہر کے جنوبی حصے میں تو یہ اور بھی خطرناک دکھائی دے رہی تھی۔

لیکن اڑیسہ کے لیے یہ بالکل معمول کی بات تھی لیکن وہاں پر ایسی دھند برسوں میں پہلی

بار پڑی ہے۔

سبزی مائل نیلے آبی بخارات کے بادلوں میں سے چھوٹا سا گول سورج اپنی تھوڑی سی چھب دکھا رہا تھا۔ چڑیاں دورانِ پرواز پتھر کی طرح سخت ہو کر فٹ پاتھ پر گرنے لگیں۔ سمندر اپنے افق تک یخ ہو کر سفید ہو چکا تھا۔ یہ ہوائیں اُسی کی جانب سے آ رہی تھیں۔

لگتا تھا عورت روسی نژاد تھی اور لڑکا بھی اُسی طرح کا تھا۔ لیکن اُس کا والد یہودی تھا، انھوں نے یہودی بستی گھیٹو کی طرف جانا تھا۔

لڑکے کا والد ریڈ آرمی میں آفیسر تھا۔ عورت نے اپنا پاسپورٹ پھاڑ کر غسل خانے میں پھینک دیا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کے ساتھ یہ سوچ کر گھر چھوڑا تھا کہ وہ اُس وقت تک سیر پر رہیں گے جب تلک ہر طرف سکوت طاری نہیں ہو جاتا۔ لوگوں کے لیے اس وقت گھیٹو کی جانب پاگل پن کے سوا کچھ نہ ہوگا کیونکہ یہ اقدام موت کے مترادف تھا۔ اس لیے اُس نے اپنے بیٹے کے ساتھ تمام گلیوں سے اجتناب کرتے ہوئے شہر میں ادھر ادھر گھومنا شروع کر دیا۔

پہلے بچہ خاموشی سے قدم اُٹھا رہا تھا پھر یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ سیر کے لیے جا رہے ہیں جلا بھنا ایسا کہنے لگا۔

''اماں ہم ہر وقت سیر ہی کیوں کرتے ہیں؟''

''ہم سیر کے لیے ہی تو نکلے ہیں گھر سے''

''سیر میں اتنی تیزی سے نہیں چلتے؟ میں تھک گیا ہوں''

''گھبراؤ نہیں بیٹے مجھے بھی تھکاوٹ ہو رہی ہے۔ لیکن میں اتنی گھبرائی تو نہیں ہوں۔

پہلے وہ بہت تیز قدم اُٹھا رہے تھے جیسے کوئی اُن کا پیچھا کر رہا ہو، پھر اُس نے خود کو آہستہ چلنے پر مجبور کیا۔ لڑکے نے جب اپنی ماں کے سوجے اور پھٹے ہوئے ہونٹوں کو دیکھا۔ نیز جب اُس کی نظر ماں کی شال سے باہر جھانکتے ہوئے مس میں چپکی ہوئی چٹیوں کو جو کہ جادو کے کھولنے کی مانند معلوم ہو رہی تھیں اور جو اس کی طرف جھانک تو رہی تھیں لیکن دیکھ نہیں رہی تھیں پر پڑی تو وہ ڈر سا گیا اور وہ اُسے پہچان بھی نہ سکا تھا۔

بچے کا بازو بھینچتے ہوئے جب ماں نے اُسے اپنے عقب میں کر لیا تو اُس نے بہت خوف محسوس کیا اور وہ چلانے لگا۔

''میں نے گھر جانا ہے۔ اور مجھ بھوک بھی لگ رہی ہے۔''

ماں اُسے ایک چائے خانے میں لے گئی جہاں پہلے ہی دو رومانیہ کے سپاہی موجود تھے جو ناشتہ کر رہے تھے۔ جنھوں نے کھلے دامنوں والے کوٹ پہن رکھے تھے۔ جن کے کالر کتوں کی کھال جیسے تھے۔ چونکہ عورت کے پاس کسی بھی قسم کے کاغذات نہیں تھے اسی لیے وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ اُسے گرفتار کر کے گھیٹو نہ بھیج دیں۔ اس لیے اُس نے غلطی سے اندر آنے کی معذرت کی اور جلد باہر نکل گئی۔

لڑکا اس کے پیچھے بھاگنے لگا یہ نہ سمجھتے ہوئے کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ دوسرا چائے خانہ خالی

تھا اس نے خوش دلی سے آس کی دہلیز کو عبور کیا جہاں گھوڑے کی نعل کو خوش بختی کی علامت سمجھ کر گاڑا گیا تھا۔ جہاں سے اس کے بچے کے لیے ایک کیک اور ایک رول خریدا۔ جب وہ سٹول پر بیٹھا تو پہلے اُس نے اپنا مظر درست کیا پھر رول کھایا پھر دودھ نوش کیا جسے وہ بہت پسند کرتا تھا۔ وہ عورت بڑی بے قراری سے فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اب کیا کیا جائے لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ لیکن جب وہاں قریب کی ایک دودھ دہی کی دکان میں ایک سٹوو جلتا ہوا دیکھا تو سوچا کہ وہاں وہ خود کو گرم کر سکتی تھی۔ پھر اُس نے محسوس کیا کہ اس دکان کی مالکہ اس کی گہری میں گہری دلچسپی لے رہی تھی اس لیے اس نے جلد سے اُسے کچھ ادا کرنے کی کوشش کی۔ مالکہ نے کھڑکی سے دیکھا اور کہا کہ وہ سٹوو کے پاس زمین پر کچھ کے لیے آگ تاپ لیں۔ سٹوو میں سے رنگ بہ رنگ کی لائٹیں نکل رہی تھیں۔ جس میں سیاہی آمیز چنگاریاں کھیل رہی تھیں۔ بچے کو آگ کی تپش میں نیند آنے لگی۔ اُس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں لیکن بچے کی ماں وہاں سے جلد نکلنا چاہ رہی تھی۔ اُس نے مالکن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اب اس کے پاس یہاں رکنے کا وقت نہیں ہے تاہم وہ یہاں ایک گھنٹے تک رک سکتے تھے۔ نیند میں ہونے اور پیٹ بھر کر کھانے کی وجہ سے اس کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ ماں نے اس کے کندھوں کو جھنجھوڑا اور اُس کے کالروں کو درست کرتے ہوئے دروازے کو اندر کی جانب دھکیلا۔ جب باہر نکلنے لگے تو بچے نے اُس نعل سے ٹھوکر کھائی لیکن پھر جلدی اُس نے اپنا ہاتھ ماں کو پکڑایا اور جلدی سے وہ پھر گلیوں میں نکل کھڑے ہوئے۔ یہاں پر چند چنار کے درخت کھڑے تھے۔ وہ برف سے اٹے ہوئے تھے وہ ان کے پاس سے گزرے۔

''میں سونا چاہتا ہوں بچے نے انتہائی سرد ہوا میں کانپتے ہوئے کہا''

''وہ آئی درسا ہے نا۔ جسے تم بہ خوبی جانتے ہو، ہم اُس سے ملنے جا رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے نا۔'' لڑکے نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ویسے بھی ملنا ملانا اُسے پسند ہے۔

یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا۔

انھوں نے سنوگنو پر سے گزر کر اس پل کو عبور کر لیا جو اس بندرگاہ کی طرف جا رہا تھا، جسے کوارٹیس سلوب کے نام سے پکارا جاتا تھا نیچے بے آباد چوک میں بکھرے بھرے پتھروں سے بنے ہوئے جو مکان تھے ان میں سے چند ایک جیسے مٹی کا ڈھیر بن چکے تھے۔ ان میں سے بہت سوں کو جلا دیا گیا تھا، ڈھلوان کی تہہ میں ایک اور پل کے نشانات دیکھے جا سکتے تھے اس سے پرے تباہ شدہ بندرگانہ کا ڈھانچہ تھا اس سے تھوڑا آگے جلی ہوئی چھتوں سے دور جو سمندر تھا وہ اُفق سے

افق تک منجمد ہو چکا تھا جہاں سے پانی کی ایک وسیع پٹی جو الگ ہو چکی تھی اس کا رنگ گہری نیلاہٹ میں بدل چکا تھا۔ رڈیلسا سفید لائٹ ہاؤس کے اردگرد سلیٹی رنگ کی رومانیہ کی گاڑیاں برف کی طرح یخ بستہ ہو چکی ہوتی ہیں۔ اس لیے تھوڑا آگے پہاڑ کی بائیں جانب شہر کا مشہور تھیٹر تھا اس کا گنبد کسی خول کی طرح لگ رہا تھا اور جو گلابی رنگ کی دھند میں شہر کے اوپر سے چھا تک رہا تھا۔ نیچے گیراج میں لوگ ٹوکریاں اٹھائے سلوو سے اوپر چڑھ رہے تھے، پانی جو ان ٹوکریوں سے رس کے گرتا وہ جم کے ہلکے گلابی رنگ کے سورج کی مدھم روشنی میں شیشے کی طرح دمکنے لگتا۔ یہ تمام کچھ بہت سُندر تھا بہرحال وہ وہاں رُکنے کے قائل ہو گئے تھے۔

انھوں نے ابھی ایک لمبا سفر طے کرنا تھا۔ لڑکا تھک چکا تھا لیکن ابھی اس میں کچھ دم خم باقی تھا وہ اپنے ننھے منے بوٹوں کے ساتھ ڈگمگاتے ہوئے کچھ تیز چل رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کا ساتھ نبھاتے ہوئے وہاں جلد پہنچنا چاہتا تھا کیونکہ اُس ملنا جلنا اچھا لگتا تھا۔ کئی بار اس کی والدہ نے اس کے رخساروں پر مساج کیا۔ اُس گھر کے قریب جہاں وہ خاندان رہائش پذیر تھا آگ کا چولہا دہک رہا تھا جس کے گرد کھڑے کچھ سپاہی آگ تاپ رہے تھے۔ گھر بہت وسیع تھا، جس کے کئی حصے تھے۔ گیٹ پر ہمیشہ ایک زنجیر چڑھی رہتی تھی۔ جیل آتے جاتے ہوئے جو بھی یہاں سے گزرتا اُسے اپنے کاغذات دکھانے پڑتے تھے۔ وہ عورت اس گیٹ سے ایسے گزر گئی جیسے وہ بہت جلدی میں ہو۔ کسی نے بھی اُس پر کوئی توجہ نہ دی۔

بچے نے پھر سے رونا شروع کر دیا۔ ماں نے اُسے گود میں اٹھا لیا اور تیز تیز چلنے لگی جیسے وہ دوڑ رہی ہو اس کے پاؤں جب ان سلیبز پر پڑتے تو وہ دھپ دھپ کی آواز پیدا کرتے۔ ایک بار پھر اس نے شہر میں گھومنا شروع کر دیا۔ اُسے ایسے لگا جیسے وہ ان گلیوں سے شناسا ہو۔ لوگوں نے اُسے بڑی گہری نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ تب اُسے خیال آیا کہ کیوں نا چند گھنٹے کسی سینما میں گزارے جائیں یہ سینمے آٹھ بجے کے بعد تب کھلتے ہیں جب لوگ موت کے خوف گلیوں میں نکلنا بند ہو جاتے ہیں چنانچہ وہ ایک سینمے میں داخل ہو گئی۔ جب وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تو اس نے دیکھا کہ سینما کا ہال لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ وہ بھی دھند سے بچنے کے لیے یہاں آئے تھے کم از کم یہ جگہ گرم تو ہے یہاں بیٹھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کی گردن کے گرد لپٹے ہوئے سکارف کو ذرا نرم کیا تو وہ فوراً سو گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی ماں کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ اُس نے سامنے سکرین پر چلنے والے پروگرام کے تمام واقعات کو غور سے دیکھا، جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کوئی جنگ کی فلم تھی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی مزاحیہ یا اسی قسم کی کوئی اور فلم تھی جسے وہ کچھ سمجھ نہ سکی تھی۔ ہر شے مبہم تھی۔ تمام سکرین پر کسی خوبصورت لڑکی کا سر چھایا ہوا

تھا، جس کے بالوں کا جوڑا اوپر کو اُٹھا ہوا تھا۔ پہلے ان دونوں نے ایک دوگانا گایا پھر وہ ایک چھوٹی سی کار میں بیٹھ کر غائب ہو گئے۔ پھر دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، جن سے ایک نہیں دھوئیں کے کئی ستون سے اُٹھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک گرج سے لگتا تھا جیسے مسلسل کئی چھتیں اڑ رہی ہوں۔ پھر مٹی کے تودوں کی ایک بوچھاڑ سی اوپر اٹھ کر نیچے گرتے ہوئے ایسے جھن جھن کی آواز پیدا کرنے لگی جیسے وہ سی دھات کے بنے ہوئے دام پر گر رہی ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک ٹینک نظر آیا جو پوست کے تازہ ہل چلے کھیتوں کو برباد کر رہا تھا۔ اس ٹینک پر جنازہ کی سیاہ صلیبیں نصب تھیں۔ سکرین پر چلتی گیس آگ کے شعلوں کی زبانیں سی نگل رہی تھیں اور ساتھ ہی ان کے منہ سے دھوئیں کی ندیاں سی بہتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک جرمن سپاہی جو مرمت شدہ فلیٹ بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ دوسرا روسی تھا، جس نے سر پر پھندنوں والی ٹوپی پہن رکھی تھی جو کانوں کو بھی ڈھانپ رہی تھی۔ وہ اس خاتون کے کندھوں پر جیسے ڈھیر ہو رہا تھا۔ پھر وہ اپنی موٹی موٹی انگلیوں سے اس کے رخساروں پر چٹکیاں بھرنے لگا اور ساتھ ساتھ کہہ رہا تھا۔ سونا نہیں سونا نہیں۔ جب وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اُس کے منہ سے لہسن اور کچی الکوہل کی بو آ رہی تھی۔ لیکن بچہ بیدار نہیں ہوا۔ صرف اس نے گردن کو گھما کر کچھ نیند کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا۔ پر جرمن سپاہی نے اپنا سر خاتون کے کندھوں پر رکھا اور پھر اس نے ایک ہاتھ سے اس ڈر سے کہ کہیں سپاہی ناراض نہ ہو جائے اور مجھ سے کاغذات طلب نہ کر لے اس سپاہی کے منہ سے دوزدہ مچھلی کی بو آ رہی تھی جس سے خاتون کو متلی ہونے لگی لیکن اس نے بڑی کوشش سے اس متلی کو الٹی میں تبدیل نہیں ہونے دیا۔ وہ برہم نہیں ہوئی اور نہ ہی اس نے کوئی ایسا تاثر ظاہر ہونے دیا۔ اس نے بس خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ بہرحال اس جرمن سپاہی کا وطیرہ کوئی غیر مناسب بھی نہیں رہا اس لیے خاتون کے لیے یہ سب کچھ قابل برداشت رہا۔ آخر وہ جلد خاتون کے کندھوں پر سو گیا۔ لیکن خاتون نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس لیے کہ اس کے لیے سپاہی کا سونا ہی بہتر تھا۔

وہ ریشمی بالوں کے جوڑے سمیت ایک بار پھر سکرین پر نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ سفید اور سیاہ شعاعوں کا ایک گچھا تمام سکرین پر حرکت کرنے لگا اور سیاہ چشمے اپنی پوری آب و تاب سے اُبلنے لگے۔ جرمن بٹالین صحرا کے ریت پر مارچ کرنے لگی اور ایک بہت بڑا نازی پرچم ایفل ٹاور پر ابھرا اور ہٹلر نے اپنی تیکھی ناک اور عورتوں جیسی ٹھوڑی کے ساتھ بھونکنا شروع کر دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اُس نے اپنی نسائی حرکتوں کو درگزر کیا اور آنکھوں کو گھماتے ہوئے تیزی

سے اپنے منہ کو کبھی کھولتا اور کبھی بند کرتا ہے۔ وہ اپنے چہرے کو اس قدر سرعت سے حرکت کرتا کہ اس کی باتوں سے سوائے مور دو۔ دو۔ کے کچھ پلے نہ پڑتا۔
اندھیرے میں جب سپاہی دوشیزاؤں کی کالیوں کو گدگداتے تو وہ چیخنے لگتیں۔ وہاں خطرناک حد تک گرمی اور حبس تھا۔ لہسن اور دود زدہ مچھلی کی ناگوار بدبو تھی۔ رومانین چاٹ زدہ پرفیوم کی خوشبو اس کے برعکس تھی۔ اس سب کچھ کے ہوتے اس سردی میں باہر سے اندر رہنا بہتر تھا۔ خاتون کچھ دیر آرام کرنا چاہ رہی تھی۔ لیکن بیٹا سو چکا تھا۔ اور آخری پروگرام ختم ہونے کو تھا۔
خاتون کو ایک بار پھر باہر جانا پڑا۔ اس نے بچے کا ہاتھ پکڑا اور باہر آ گئی۔ باہر بہت تاریکی تھی وہاں اندھیرے گھروں کے درمیان گہری دھند چکر کاٹ رہی تھی، جس نے اُس خاتون کی پلکوں کو ایک دوسری میں پیوست کر دیا تھا۔ گلیوں میں دھواں اگلتی آگ جل اُٹھی لیکن دھند نے جیسے اس آگ کا گلا دبا تھا۔ بعض اوقات کہیں سے سے فائر کی آواز سنائی دیتی۔ گشت کرنے والا گروپ گلیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس وقت آٹھ بج رہے تھے۔ اُس نے بچے کو اُٹھایا جو نیند سے بوجھل ہو رہا تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں گشت کرنے والے انھیں روک نہ لیں۔ وہ دوڑ پڑی۔ خاتون نے ویران گلیوں والے علاقے کو چنا۔ پلنز کیگر۔ سردی میں سکڑے یہ پیڑ سڑک کے کنارے کھڑے مردوں کی طرح لگ رہے تھے۔
سارا شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا پوری طرح سنسان لگ رہا تھا۔ بعض اوقات اس تاریکی میں ایک دروازہ کھلتا جس میں سے وائلن کی بڑی درد بھری دھنیں برآمد ہوتیں۔ اس کے ساتھ ہی روشنی کی ایک پٹی جو قہوہ خانے سے وارد ہو رہی تھی وہ اس دروازے سے ملحق برف سے فریز ہوتی کاروں پر پڑ رہی تھی یہاں پر سمندر کنارے عورت کو تحفظ کا احساس حاصل تھا۔ یہاں کی ہر شے تاریک اور خاموش تھی۔ خاص طور پر کافی گہری کھڑی چٹان کے نیچے سے سمندر کو دیکھا جا سکتا تھا۔ سمندر کی سطح دیوار جیسی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ چند ایک بڑے ستارے درخت کی سفید شاخوں کے بیچ میں جگمگا رہے تھے۔ نیز ان کے درمیان سے سرچ لائٹ کی نیلی لکیر سی پھیلتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس خاموش ماحول میں وہ عورت اسفلٹ سڑک کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی جس کی بائیں جانب وہی سٹیڈیم تھا جہاں انھوں نے روڈیبا۔ کھار کو میچ دیکھا تھا۔
اُس تباہ حال سٹیڈیم سے پرے سمندر تھا۔ لیکن اندھیرے کی وجہ سے وہ اسے دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ لیکن اس خاموش ماحول میں اس کا تصور ہی کر سکتی تھی۔ اس کی بائیں جانب پارک تھا۔ اسفلٹ روڈ ستاروں کی روشنی میں ایمبری بیپر کی طرح چمک رہی تھی۔

خاتون چلتی جا رہی تھی اور پیڑوں کی اقسام کا جائزہ بھی لیتی جا رہی تھی۔ ان جانے پہچانے درختوں Catalpas، پاپلر کیکر اور ریمز کے پیڑوں کی شاخیں جھک کر زمین کو چھو رہی تھیں۔ اب اس نے آہستہ چلنا شروع کر دیا۔ لیکن جب وہ نشیبوں کی ایک رو کے پاس سے گزری تو اس نے وہاں ستانا چاہا۔ لیکن وہاں پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ وہاں سے دھڑکتے دل کے ساتھ اُس شخص کو پیچھے چھوڑا آگے جب اُس نے نظر دوڑائی تو وہاں پر ایک کبڑا شخص اپنا سر اپنی سیٹ کی پچھلی جانب لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ وہ کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ پیڑوں کی مانند آدھا برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ ایک تجربہ گاہ تباہ شدہ میں سفید بادلوں کے نیچے سے سر نکالے کھڑی ہے۔ گریٹ بیر کے ستارے جگمگا رہے تھے۔ یہاں پر مکمل خاموشی تھی لیکن کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔ لیکن اس خاتون کو گھبراہٹ اس لیے نہیں تھی کہ وہ تھک چکی تھی۔

دوسرے روز سورج ابھی طلوع ہونے ہی والا تھا کہ لاریاں ان اجسام کو جو رات کے دوران برف کی طرح یخ ہو چکے تھے لانے کے لیے آئیں۔ اُن لاریوں میں سے ایک سڑک کے ساتھ چلتی ہوئی پارک میں آ کر دوبارہ رُکی۔ ایک بار وہاں جہاں بوڑھا شخص برف کی مانند فریز ہو چکا تھا دوسری بار اس بینچ کے پاس آ کر رُکی۔ جہاں وہ خاتون اور اس کا بچہ ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ خاتون نے بچے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ دونوں نے تقریباً ایک جیسا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ دونوں کے کوٹ نقلی ریشم کے بنے ہوئے تھے۔ دونوں کے بوٹ اور دستانے ایک جیسے تھے وہ ایسے بیٹھے ہوئے تھے جیسے وہ زندہ ہوں۔ ان کے چہرے رات کے دوران برف سے ڈھک چکے تھے، جو سفید روئی کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی پلکوں سے برف کی سفید لڑیاں سی لٹک رہی تھیں۔ جب وہ انھیں اٹھانے لگے تو ان کے لیے انھیں سیدھا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ فوجیوں نے جب عورت کی لاش کو ایک بھاری جھٹکے سے لاری میں پھینکا تو وہ ایک بوڑھے شخص سے جا ٹکرائی۔ انھوں نے بیٹھے ہوئے بچے کو بآسانی ایک ہلارے سے جب لاری میں ڈالا تو وہ اپنی ماں کے پاس جا گرا۔ گرتے وقت بچے کی لاش تھوڑی سی اچھلی جیسے ہی لاری روانہ ہوئی تو لاؤڈ سپیکر سے ایک مرغ کی سی آواز گونجی جو صبح کے نمودار ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ پھر ایک بچے کی فرشتوں جیسی آواز نے تین بار کہا۔ صبح کا سلام، صبح کا سلام، صبح کا سلام۔ پھر اُسی آواز نے رومانوی زبان میں کہا۔

Our Father which art in Heaven Hallowed be ghy kingdom come....

☆☆☆☆☆

مجرم کون؟

میں جب گھر سے دکان کی طرف آتا ہوں تو دکان کے قریب چوک ہے، جس کے درمیان پٹی ہے جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درخت لگے ہیں اور درمیان میں کہیں کہیں گھاس اُگی ہے مگر زیادہ تر اس میں کوڑا کرکٹ اور گند بھرا ہوتا ہے۔ چوک کی جگہ بہت چوڑی ہے۔ یہاں بجلی کے کھمبے اور مختلف کمپنیوں کے بورڈ لگے ہیں۔ صبح کے وقت یہاں دکانیں بند ہوتی ہیں۔ میں جب یہاں سے گزرتا ہوں تو ایک منظر تقریباً روز دیکھتا ہوں مختلف عمر کے لوگ جن کے لباس اور چہرے میلے سے چکٹ اور جسمانی طور پر لاغر یہاں بیٹھے ہوتے ہیں کبھی کبھی اُن میں ایک دو لڑکیاں اور ہیجڑے بھی شامل ہوتے ہیں جنھوں نے بھدی قسم کی سرخی لگائی ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کی ٹانگوں اور بازوؤں پر زخم ہیں، جن سے خون رس رہا ہوتا ہے۔ انھوں نے ٹیکہ لگانے والی سرنج پکڑی ہوتی ہے جس سے کوئی سیّال اپنے بازوؤں میں انجیکٹ کر رہے ہوتے ہیں۔ بغیر نمبر پلیٹ موٹر سائیکلوں پر سادہ کپڑوں میں چند پولیس والے بھی اُن کے اردگرد منڈلا رہے ہوتے ہیں۔

محمد حنیف

ٹریفک پولیس والے چوک میں کھڑے ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ قریب ہی پولیس چوکی ہے جہاں چالان کے کاغذ واپس ملتے ہیں۔ کبھی کبھی ان لوگوں کے پاس ایک موٹر سائیکل والے کو کھڑا دیکھتا ہوں جس کے روبرو یہ نشیئے ہاتھوں میں نوٹ پکڑے گڑگڑا رہے ہوتے ہیں جب روپے کے بدلے وہ اُن کو پُڑیا دیتا ہے تو ان کے چہروں پر زندگی کی رمق نظر آتی ہے ان لوگوں کا کام مانگنا ہے یا چھوٹی موٹی چوریاں کرتے ہیں۔ یہ شاہراہ شہر کی معروف شاہراہ ہے جہاں سے پولیس کی، تاجروں، سرکاری افسران کی گاڑیوں کی آمدورفت ہر وقت جاری رہتی ہے۔

میں جب یہاں سے گزرتا ہوں تو اُن کی حالت دیکھ کر اپنے دل میں اِک کرب محسوس کرتا ہوں اور سوچتا ہوں اس نسل کی بربادی کا منظر یہاں سے گزرتے حکام، سیاست دان، علماء وڈاکٹر، مبلغین، اصلاح کارادواروں، الفاظ کے بازیگروں کو، کسی کو بھی نظر نہیں آتا۔ میرے جاننے والے ایک بڑے صاحب نے ایک بار مجھے کہا تھا ”بچے تم ان کا اتنا فکر ذکر نہ کیا کرو یہ ایک تو غریب لوگ ہیں دوسرا ان میں کچھ غیر ذمہ دار ماں باپ کی اولادیں ہوتی ہیں۔

میری دکان کے کچھ فاصلے پر ایک سرکاری دفتر ہے، جس کے اردگرد ایک خفیہ والا ڈیوٹی دیتا ہے وہ عام کپڑوں میں ہوتا ہے۔ اس سے میری رسمی سی علیک سلیک ہے۔ خفیہ والا جب کبھی کھڑا کھڑا تھک جاتا ہے یا پانی کی طلب ہو تو کچھ دیر کے لیے میرے پاس آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک روز میں نے خفیہ والے سے پوچھا۔ سر جی یہ نوجوان جو نشہ کی حالت میں چوک میں گرے پڑے ہوتے ہیں آپ نے دیکھے ہیں؟

خفیہ والے نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ہاں دیکھتا ہوں اور جگہ جگہ دیکھتا ہوں اس کے جواب میں غصہ کا تاثر تھا جیسے میری بات کو اُس نے طنز سمجھا۔ اُس نے کچھ دیر خاموشی کے بعد مجھے مخاطب کر کے کہا۔ دیکھو بھائی! اس وقت چار کاروبار ایسے ہیں جن میں کمائی اربوں کھربوں میں ہے۔

ایک منشیات اور اس کی تقسیم۔

دوسرا اسلحہ کی سپلائی اور اُس کی کمیشن۔

تیسرا زمینوں کے کاروبار کے نام پر قبضے اور ان کریمنل لوگوں کا تحفظ اور اُن کے مطلب کے فیصلے لے کر دینے والے دلال جو فیس کے نام پر کروڑوں روپے وصول کر رہے ہیں۔

چوتھا جسم فروشی جو، اب محلے محلے پھیل رہا ہے اور اب تو پانچواں کاروبار اغوا برائے تاوان بھی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ان برائیوں کو ختم کرنے کی ذمہ داری جن محکموں کی، سو، وہ ان کے معاون بن گئے ہیں

اُن لوگوں نے ضمیر کی جگہ ڈالر بکس نصب کر لیے ہیں اب اُن کے کاروبار میں ان کی اولادیں ان سے بھی زیادہ کامیاب ہیں اگر کہیں بھول سے ان کے مکروہ چہروں سے نقاب اُتر بھی جائے تب بھی اُن کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کمیشن ایجنٹ، رشتے، مراسم، زور، زر والے ہنر کار بڑے بڑے وکیل اُن کی معصومیت اور پاکبازی کے سرٹیفکیٹ لے کر دینے والے موجود ہوتے ہیں اور کرائے کے قاتل سکیورٹی کے بھیس میں اُن کے محافظ ہیں ان لوگوں کے شوق بھی شرمناک ہیں یہ ملک میں مہنگی ترین داشتائیں رکھتے ہیں اور ملک سے باہر خفیہ اکاؤنٹ۔

منشیات، اسلحہ، کرائم کے پھیلاؤ اور اُن کو راستہ مہیا کرنے والوں کا اداروں کے حکام کو علم ہے مگر۔؟

اس نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر گویا ہوا اور یہ جو تم ان لوگوں کو دیکھ رہے ہو۔ ان میں اکثریت ایسے نوجوانوں اور بچوں کی ہے جو محنت مزدوری اور کام کرنے والے تھے مگر طبقاتی خلیج، سیکس میں لتھڑی فلمیں اور سسٹم جو کھلم اور بنیادی طور پر ناانصافی پر کھڑا ہے اور ان کوششوں، بے راہروی اور ذلالت کی دلدل میں دھکیل دیا ہے۔ میری بیس سال کی سروس ہو گئی ہے میری وردی پر ایک پھول لگا ہے مگر میں پانچ مرلے کا گھر نہیں بنا سکا باپ کے گھر میں رہتا ہوں میرے نزدیک اُن لوگوں کے ساتھ شامل ہونا جہنم خریدنا ہے۔ اس لیے مجھے جو ڈیوٹی دیتے ہیں اس کو وہ ''کھڈے لائن'' کہتے ہیں۔ سسٹم اب اتنا خراب ہو چکا ہے وہ لوگ جو قالینوں کے کارخانوں میں روپیہ روز پر مزدوری کرتے تھے۔ ریڑھیاں لگاتے تھے۔ سپاہی نائب قاصد کلرک کی سطح کی ملازمتیں کرتے تھے، جب عوام کے اعتماد کو حاصل کر کے اقتدار میں آئے تو اُن کی اوقات بھی ریس کے اس گھوڑے کی ہو جاتی ہے جس پر جواریوں نے کروڑوں روپے فکس کیے ہوتے ہیں اقتدار پر قبضہ کرنے والے جرنیلوں سے یہ رابطہ رکھتے ہیں اور ایمان اُن کا فارسیل ہوتا ہے۔ نشے کے خاتمہ، بچوں کی تعلیم و تربیت۔ مزدوروں کی فلاح، عورتوں کے حقوق۔ دین کی عظمت انسانیت کی سربلندی کے لیے جو ادارے دعویدار ہیں وہ بھی بزنس کر رہے ہیں کروڑوں کما رہے ہیں۔ غیر ملکی دورے اور غیر ملکی سفارت خانوں میں شراب نوشی ان کا مشغلہ ہے ہر شعبے کو روپے حاصل کرنے کی ہوس نے تباہ کر دیا ہے۔

صحافی، قلمکار، دانشور، ترقی پسند، مذہبی رہنما، اینکرز، تھنکرز وغیرہ کی قیمت بھی بند لفافے اور پلاٹ ہیں۔ ایوارڈ بھی ان کو مل جاتے ہیں مگر وفاداری میں یہ لوگ گرگٹ کی

طرح رنگ بدلتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے اور افسوس تو یہ ہے کہ پھر بھی یہ لوگ معزز، محترم اور مکرم ہیں۔ اور یہ ایک ایسا ڈرامہ ہے جو مسلسل چل رہا ہے۔

خفیہ والا میرے مختصر جواب کا طویل ترین جواب دے کر چلا گیا مگر مجھے اس کی دلیلوں نے سخت پریشان کر دیا مگر یہ پریشانی بائیس کروڑ عوام کا مقصدر ہے۔

ایک صبح دکان کی صفائی کے بعد میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

السلام علیکم!

میں نے جب اُس کی طرف دیکھا تو اُس کا چہرہ میل کی تہہ سے بھرا ہوا تھا قمیض کے دونوں بازو غائب تھے گلا پورا کھلا ہوا تھا۔ شلوار پائنچوں سے اوپر تک اُدسی ہوئی تھی۔ کپڑوں پر جمی گندگی کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کپڑے سلوانے کے بعد سے آج تک دھوئے نہیں گئے اور جو کچھ بھی ہاتھوں سے کھایا پیا۔ ہاتھوں کی صفائی ان کپڑوں سے ہی کی گئی ہے چہرہ اُس کا ایسا تھا جس سے گھن آئے آنکھیں پتلیوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں جس نے چہرے کو مزید بدصورت بنا دیا تھا۔ میں نے اُس کے پاؤں کی طرف دیکھا جو بوٹوں کے بغیر تھے گرد اور میل جلد کا حصہ بن گئے تھے۔ جسم کے کئی حصوں خاص طور پر ٹانگوں اور چہرے پر چھوٹے چھوٹے زخم تھے۔ جس سے پانی رس رہا تھا ان زخموں کو دیکھ کر لگتا تھا یہ جلد کے اندر تک گہرے ہیں اور خراب ہو چکے ہیں۔ یہ لڑکا جس نے مجھے سلام کیا تھا اور میری کرسی کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا تھا وہ موسم اور تکلیف کی ہر کیفیت سے بے نیاز تھا۔

تمھارا نام کیا ہے؟ میں نے اُس سے پوچھا

بابو جی میرا نام تو اسلم قریشی ہے مگر سب مجھے اسلہ کہہ کر بلاتے ہیں۔

تمھاری عمر کیا ہے؟

بابو جی میری عمر پندرہ سال ہو گی

کیا تم کوئی نشہ کرتے ہو؟ میں نے پھر سوال کیا

بابو جی صرف چرس پیتا ہوں یا کبھی کبھی ہیروئن کے سگریٹ کا کش لگا لیتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے عادی نہیں ہوں۔

دن میں کتنی چرس پی لیتے ہو؟ میں نے پوچھا

بابو جی کوئی سو دو سو روپے کی دن میں پی لیتا ہوں کما تو تین چار سو روپے لیتا ہوں مگر رات کو فلم بھی تو دیکھنی ہوتی ہے۔

یہ چرس کتنے عرصہ سے پی رہے ہو؟

میرے اس سوال پر وہ مسکرایا جس میں کچھ فخر کا احساس بھی تھا۔

بابو جی چرس تو میں پانچ چھ سال سے پی رہا ہوں۔

میں نے حیرت سے اُس لڑکے کی طرف دیکھا اور خود سے حساب لگایا۔ تو کیا یہ نو دس

سال کی عمر سے چرس پی رہا ہے۔

تمھارے ماں باپ ہیں؟ میں نے ایک اور سوال کیا

بابو جی سب کچھ ہے جی بس ماں مرگئی تھی۔ باپ ٹرک کنڈیکٹر تھا وہ زیادہ تر باہر ہی رہتا تھا اُس کی ایک بہن تھی، جس کے پاس میں رہتا تھا وہ مجھے بہت مارتی تھی۔ کھانے کے وقت اور کھانا مانگنے پر تو اکثر مار پڑتی تھی۔ ہاتھوں کے علاوہ جو چیز بھی اُس کے ہاتھ آجاتی اُس سے میری مرمت کرتی بھوک اور مار سے تنگ آ کر ایک دن جو گھر سے نکلا تو پھر واپس نہیں گیا۔ یہاں آیا تو سینما کے آگے ایک شخص گنڈیریوں کی ریڑھی لگاتا تھا جس کو سب اُستاد کہتے تھے اُس کے پاس کام شروع کیا۔ انٹرول کے دوران سینما کے اندر گنڈیریاں بیچتا تھا۔ اُستاد چرس کا سگریٹ پیتا تھا۔ پہلے تو میں عام سگریٹ پینے لگا۔ پھر ایک دن اُستاد نے چرس والا سگریٹ پکڑا دیا ویسے بابو جی اللہ کا شکر ہے کنگلوں سے دور رہنے کی وجہ سے ہیروئن کا عادی نہیں ہوں۔

اچھا! تو تم پھر دوبارہ گھر نہیں گئے؟

نہیں بابو جی میں پھر نہیں گیا البتہ باپ اب دو تین سال سے میرے پاس ہے۔ بہت کمزور ہوگیا تھا۔

کیا تمھارا باپ تم کو چرس پینے سے منع نہیں کرتا؟ میں نے مزید سوال کیا

لڑکا میرے اس سوال پر مسکرایا اُس کے مسکرانے سے اُس کا خراش زدہ چہرہ اور خراب لگنے لگا۔ بابو جی یہ کنڈیکٹر لوگ جو ہوتے ہیں اُس نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا زیادہ تر گھر سے باہر رہتے ہیں اور یہ باہر سب کچھ کھاتے پیتے ہیں۔ پہلے پہلے تو چند دن مجھے چرس پینے سے منع کرتا رہا پھر ایک دن کہنے لگا میرا جسم ٹوٹ سا رہا ہے اور مجھ سے چرس والا سگریٹ پکڑ کر خود ہی پینے لگا۔

اچھا یہ جو تم تین چار سو روپے روز کما لیتے ہو تو سات آٹھ روپے کا صابن لے کر کپڑے کیوں نہیں دھو لیتے؟

لڑکا میرے اس سوال پر خوب ہنسا واہ بابو جی آپ کا خیال ہے ہم اپنا کاروبار خراب کر لیں بات بابو جی یہ ہے اس نے پھر مجھے سمجھانے والے انداز میں بتانا شروع کیا گندے کپڑوں کی وجہ سے ہماری بدبو اُن صاحب لوگوں کی طبیعت خراب کرتی ہے۔ لوگ فوراً پیسے دے کر چاہتے ہیں ہم اُن کے پاس سے چلے جائیں۔ دوسری بات بابو جی یہ بھی ہے رات والی فلم بھی دیکھنی ہوتی ہے اس کا ٹکٹ کافی مہنگا ہوتا ہے اور پھر عام طور پر ہماری کمائی پولیس والے بھی چھین لیتے ہیں۔ اور ان استاد ٹائپ لوگوں کو بھی جب پتہ ہو ہمارے پاس پیسے ہیں تو وہ ہم کو زبردستی اپنے ساتھ جوئے

پر بٹھا کر ہمارے پیسے چھین لیتے ہیں۔ ہماری جیب میں تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کھانا پینا بھی ہمارا بس اسی طرح ہوتا ہے جو صاحب لوگ کھانے پینے کی دکان پر کھا رہے ہوتے ہیں اُن سے جب ہم مانگتے ہیں تو وہ لے دیتے ہیں یا جو اُن سے نہیں کھایا جاتا اُن کا چھوڑا ہوا وہ کھا لیتے ہیں۔

اُس کی باتوں سے لگتا تھا یہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں انسان رویوں بھوک۔ ذلت تشدد سب وارداتوں سے گزر چکا ہے اور نشے نے اُس کا بچپن، جوانی، خواب۔ سب کو پاتال میں غرق کر دیا ہے۔

رہتے کہاں ہو؟ میں نے مزید پوچھا

بابو جی وہ سینما کے سامنے جو فلمی دفتر والی گلی ہے نہ اُس کے آگے پان والی دکان ہے۔ پان والی دکان کے سامنے جو دکانیں ہیں وہ شام کو بند ہو جاتی ہے اُن کے تھڑے پر اپنا ڈیرہ ہے بستر وغیرہ کہاں رکھتے ہو؟

بابو جی ہم کو نہ سردی لگتی ہے نہ گرمی بس ایک دو سگریٹ پیئے اور نیند آ گئی۔ بستر کا کیا کرنا ہے۔

ایک دن میں چوک سے گزر رہا تھا۔ میں نے دیکھا وہی لڑکا سڑک پر لیٹا ہوا تھا۔ ٹانگیں آپس میں اس طرح اکٹھی ہوئی تھیں جیسے پولیو کے مریض کی ہوتی ہیں۔ ہاتھوں کے سہارے رینگ رینگ کر سرخ اشارے پر رُکی ہوئی گاڑیوں میں بیٹھے لوگوں کی طرف آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارے سے بھیک مانگ رہا تھا اُس کی حالت سے لگتا تھا۔ مختلف امراض، بھوک بے گھری اور نشے نے اُس کی صحت کا تمام رس چوس لیا ہے اور یہ پندرہ سولہ سال کا بوڑھا نما لڑکا زندگی سے جلد آزاد ہونے والا ہے۔

یہ کس نے کہا تھا؟ جس معاشرے میں بچپن اور بڑھاپے کو تحفظ نہ ہو وہ زوال معاشرہ ہوتا ہے۔

میں سوچ رہا تھا مملکتِ خداداد کا یہ بچہ جس کا بچپن اور لڑکپن حالات کے جبر نے تہس نہس کر دیا۔ ذلت اور غلیظ زندگی جس کا مقدر بنا دی گئی۔ جس کا نام سوسائٹی نے کنگلا رکھا جن کو صرف دھتکارا ہی جا سکتا ہے۔ آرائش سے جن کے بدن محروم اور محبت کے دو بول سے جن کے کان نا آشنا ہیں، جن کو نالی کا گندہ کیڑا بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اس خود ساختہ جبر کے نظام کے چنگل سے کبھی آزاد ہو کر انسان کا مقام حاصل کر سکیں گے۔

قریب کسی دکان سے سی ڈی پر علامہ اقبال کا کلام نور جہاں کی آواز میں فضا میں سوز گھول رہا تھا:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہر لحظہ ہے.....

☆☆☆☆☆

وہ غمگسار میری

افشاں سجاد

میں دبے دبے قدموں سے ہسپتال میں داخل ہوئی۔ جدید طرز کے ہسپتال کی خاموش اور اُداس فضا میں مختلف دواؤں اور جراثیم سے نجات کے لیے فرش پر ہر دم پھیری جانے والی ٹاکیوں کی بدولت ایک عجیب ناخوشگوار سی بُو رچی ہوئی تھی جو دل کے بوجھ میں فوری اضافے کا سبب بن رہی تھی۔ گول زینے سے گزر کر پہلی منزل پر واقع انتہائی نگہداشت کے وارڈ کے سامنے ایستادہ بنچوں پر بہت سے لوگ سر جھکائے اپنے اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے سے بیٹھے تھے یا سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے اپنے اندیشہ وفکر کی تفصیلات پر گفت وشنید میں مصروف تھے۔ ہر کسی کے چہرے پر پریشانی اور امید و یاس کے تاثرات نمایاں تھے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے سی سی یو کا دروازہ نیم وا دیکھ کر اندر جھانکا تو اس سے آگے ایک اور بند دروازہ نظر آیا۔ یہاں آپ اپنے جوتے اتار کر اندر والے دروازے سے سی سی یو میں داخل ہو کر وارڈ میں موجود اپنے اپنے مریضوں کے پاس صرف پانچ منٹ کھڑے رہنے کے مجاز ہو سکتے تھے۔ میں نے آہستگی سے جوتے اتارے اور سی سی یو

کے داخلی دروازے سے وارڈ کے اندر قدم رکھا۔ سامنے معلوماتی کاؤنٹر پر دو تین ڈاکٹر سر جھکائے فارم پُر کرنے اور لکھنے لکھانے کے کام میں مصروف نظر آئے۔ اس کاؤنٹر کے چاروں طرف الگ الگ کمروں کی طرح تین دیواروں پر مشتمل خانے سے بنے تھے جن میں دل کی شدید ترین بیماریوں کے شکار مریض نیم اندھیرے میں اپنے اپنے بستر پر دراز اپنے اپنے درد سے نمٹ رہے تھے۔ میری نظر تیسرے کمرے میں بستر پر پڑی مریضہ پر پڑی۔ یہ لٹی تھی۔ ایک لمحے کو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ ہسپتال کے اس صاف ستھرے بستر پر آنکھیں بند کیے بے سدھ پڑی تھی۔

اس کی ناک میں آکسیجن کی نالی لگی تھی۔ ہاتھ پر ڈرپ کے لیے کنولا لگا تھا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں میں غذا کے حصول و خروج کے لیے بہت سی نالیاں لگی تھیں۔ اس کے سرہانے دل کی دھڑکن نوٹ کرنے والی مشین پر مختلف قسم کے ڈیزائن اُبھر اُبھر کر مٹ رہے تھے اور مٹ مٹ کر اُبھر رہے تھے۔ قریب ہی ایک اسٹینڈ پر غذا اور دوا کا سلنڈر دھرا تھا۔ دو تین اور بھی جدید ترین مشینیں اس کے سرہانے رکھی تھیں۔ اس کے کاندھے تک لانبے بالوں کو دو حصوں میں بانٹ کر دو چوٹیاں گوندھی گئی تھیں۔ اس نے ہسپتال کی طرف سے فراہم کردہ مریضوں کے لیے مخصوص چوغہ پہن رکھا تھا۔ سینے تک ایک سفید براق چادر اوڑھی ہوئی تھی اور اس کے دونوں ہاتھ بستر کے دونوں اطراف میں بالکل ساکت دھرے ہوئے تھے۔ ہاتھوں پر ہلکی ہلکی سوجن تھی اور چہرہ بھی سوجن کی وجہ سے گول گول سا معلوم ہو رہا تھا۔ ان دو چوٹیوں اور اپنی ننھی سی ناک اور گول گول چہرے سے وہ موم کی گڑیا کی طرح بے بس اور معصوم نظر آ رہی تھی۔

میں نے آہستگی اور نرمی سے اس کے ہاتھ کو چھوا۔ وہ کہنیوں تک برف کی مانند سرد تھا۔ میں تھوڑی دیر اس کے ہاتھ کو سہلاتی رہی۔ اس کے ہونٹ آہستہ سے ہلے۔ میں نے غور سے سننے کی کوشش کی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''گرمی''۔ میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس کی پیشانی پسینے میں تر تھی۔ میں نے گھبرا کر اس کی اٹینڈنٹ کو دیکھا۔ ''سسٹر۔ انھیں بہت گرمی لگ رہی ہے اور ان کے ہاتھ بہت ٹھنڈے ہیں۔'' نرس نے اس کے ماتھے کو چھوا۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ کمرے کو خوب ٹھنڈا کیا گیا تھا۔ اوائل نومبر کے لحاظ سے بھی کمرہ اچھا خاصا خنک تھا۔ ''افشاں، میرا دوسرا ہاتھ سہلا دو۔'' اس نے دھیرے سے کہا تو میں نے دوسری جانب جا کر اس کا دوسرا ہاتھ سہلانا شروع کیا

جو پہلے ہاتھ کی مانند کہنی تک بالکل یخ تھا۔

''کمرہ تو اچھا خاصا ٹھنڈا ہے۔'' نرس نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ نشی عمر کی محض چوتھی دہائی میں دل کے ایک ایسے لاعلاج مرض کا نشانہ بن چکی تھی جو شاید لاکھوں میں سے کسی ایک کو ہوتا ہے۔ اس کے دل کے عضلات کام کرنا چھوڑ رہے تھے۔ اس کے دل کا بایاں حصہ اس کے دل کے دائیں حصے کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ دل جو انسانی زندگی کا منبع ہے اس کے دوران خون کو صحت بخش طریقے سے رواں رکھنے سے صاف انکاری ہو گیا تھا۔ جس کا اثر اس کے جسم کے باقی اعضا پر بھی پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ دل کے ناقص فعل کی بنا پر اس کے گردے، پھیپھڑے، جگر سب متاثر ہو رہے تھے۔ ڈھائی برس تک اس جان لیوا بیماری سے کسی بہادر سورما کی طرح نبرد آزما رہنے کے بعد آخر کار آج وہ ہسپتال کے اس صاف ستھرے بستر پر بے بس پڑی اپنی زندگی کے آخری دن گن رہی تھی۔ اسی سال نومبر میں اسے کراچی سے لاہور کے اس جدید ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ لاہور جہاں اس کا میکہ تھا۔ اس کے سب قریبی عزیز اس کے آخری دنوں میں اس کی دیکھ بھال کے لیے تڑپتے ہوئے دلوں سے نکلتی ہوئی دُعاؤں کے ساتھ ہر گھڑی ہسپتال میں موجود تھے۔ دُعائیں، جن کی قبولیت کا وقت ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور وہ ایک ایک پل اسے اپنی زندگی سے دور جاتے ہوئے دیکھنے پر مجبور تھے۔

میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ میں نے جلدی سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تاکہ وہ میری بزدلی کا یہ نظارہ نہ دیکھ سکے۔

''اونہوں۔'' سسٹر نے میری جانب تنبیہہ آمیز نظروں سے دیکھا۔

''لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی۔'' میں نے اپنے آنسوؤں کا دفاع کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی ایسا مت کیجیے۔''

سسٹر کے ان الفاظ نے مجھے شرمندہ سا کر دیا۔ میں نے جلدی سے اپنی آنسوؤں سے نم آنکھیں صاف کیں اور بھاری قدموں سے چلتی ہوئی سی سی یو سے باہر نکل آئی۔ واپس اس دنیا میں جہاں آج سے کئی برس پہلے ہم دونوں نے بچپن سے جوانی تک کا سفر ایک ساتھ طے کیا تھا۔

زندگی کے اولین دور پر نظر ڈالتی ہوں تو اس کا ساتھ بہت یاد آتا ہے۔ یوں تو ہمارے اور بھی بہت سے کزن تھے لیکن اس کے ساتھ ہمارا رشتہ کچھ اور ہی طرح کا تھا۔ نشی

میرے ماموں کی بیٹی تھی اور بچپن کا کچھ حصہ ہم نے ایک ساتھ ایک ہی گھر میں گزارا تھا۔ پھر جب وہ الگ گھر میں منتقل ہو گئے تب بھی ہمارے لیے ان کے گھر جانے کی خبر کسی مژدۂ جانفزا سے کم نہ ہوتی تھی۔ ہمارے اور ان کے والدین میں کبھی بنتی کبھی بگڑتی لیکن اس سے ہم بچوں کے آپس کے تعلقات پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ ہم ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر جیتے اور آپس میں ملاقات کا کوئی بہانہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ نجانے وہ کون سا اٹوٹ بندھن تھا جس میں ہم شروع ہی سے بندھ گئے تھے۔ آپس میں نہ کوئی تکلف تھا نہ کوئی بناوٹ۔ کبھی اپنی کوئی کمی، کوئی کمزوری ایک دوسرے سے چھپانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اتنا قریبی تعلق، اتنا پیار بھرا ساتھ رہا پھر بھی اس کی شخصیت کا احاطہ کرنا چاہوں تو الفاظ نہیں ملتے۔ بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ وہ بہت مثبت انداز فکر کی حامل، اتنی پُرخلوص اور محبت بھری ہستی تھی جس کے بارے میں کبھی گمان تک نہ گزرا تھا کہ اس قدر جلد ہم سے بچھڑ کر وہاں کا رُخ کرے گی جہاں سے کبھی کسی کو پلٹتے نہیں دیکھا۔

اس کی زندگی سے بھرپور ہنسی، اس کی شرارت بھری مسکراہٹ، اس کی خوبصورت باتیں، اس کی محبت کا وہ انداز جواب کہیں دکھائی نہیں دیتا، اس کا شعری اور ادبی ذوق، اس کی انصاف پسندی، زندگی کے معاملات میں توازن رکھنے کا حوصلہ، اس کی من موہنی صورت، اس کا شفاف دل۔ کس کس بات کو یاد کروں۔ کس کس قصے کو دہراؤں۔ اب اسے کہاں سے لاؤں---؟

''سنو افشاں۔ معلوم ہے دادی اماں کتنی بیمار ہیں۔ اچانک ہی انھیں جانے کیا ہو گیا ہے۔'' وہ پریشان سی ہو کر مجھے مخاطب کرتی۔

''ہاں بھئی۔'' میں اسی فکرمندی سے کہتی اور ہم دونوں کی آنکھوں میں ایک ہی سوال ابھرتا۔ ''اگر دادی اماں کو ہماری شادیوں سے پہلے کچھ ہو گیا تو---؟'' اس خیال کے دل میں جڑ پکڑنے سے پہلے ہی ہم اسے جھٹک دیتے اور اپنے مستقبل کے حسین سپنوں میں کھو جاتے جس کی حقیقی تصویر کے بارے میں ہم نے ٹھیک سے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ ہم تو اپنی ہی تصوراتی دنیا میں مست تھے۔ ایک ہفتے کے فرق سے ہم دونوں کی شادیوں کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی اور اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے دادی اماں اچانک ہی شدید بیمار ہو گئی تھیں۔ ہماری خودغرض محبت کو صرف اپنے ارمان پورا ہونے سے مطلب تھا۔ نشی اس معاملے میں

مجھ سے زیادہ سمجھدار تھی۔ اسے حقیقی دنیا کا کچھ نہ کچھ ادراک ضرور تھا۔
میں کبھی کبھی اس پوچھتی۔ "فرض کرو نشی اگر ہماری شادیاں ہماری پسند سے نہ ہو سکیں تو۔۔ تو کیا ہو گا۔ یہ دونوں تو بے چارے کبھی شادی نہ کریں گے۔"
اس بات پر وہ خوب قہقہے لگاتی۔ "ارے افشاں۔ کیا بات کرتی ہو۔ کیوں نہ کریں گے یہ شادی۔؟" وہ شرارت سے ہنس کر کہتی۔ مجھے اس کے جواب اور اس حقیقت پسندانہ سوچ سے ایک دھکا سا لگتا۔
"کرلیں گے شادی؟ کسی اور سے؟ پھر کیا فائدہ اتنا مرنے کا ایک دوسرے پر۔؟" میں حیران ہو کر کہتی۔
وہ ہنس دیتی۔ وہ دنیا کی تلخ حقیقتوں سے اتنی انجان نہ تھی ۔ وہ کسی مغالطے میں نہیں تھی۔ اس نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی اپنے شوہر کو دوسری شادی کرنے سے روکنے کی کوئی قسم نہیں دی۔ وہ زندگی کے حقائق سے بخوبی آگاہ تھی۔ اس نے کبھی کسی سے کوئی غیر حقیقی مطالبہ کیا ہی نہیں۔
اس کی بیماری کے دنوں میں بھی میں جب کبھی اس کی بے چینی دیکھ کر اس کے پاؤں دابنے کی کوشش کرتی وہ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے روک دیتی۔ میں اصرار کرتی تو ہنس کر کہتی۔ "بھئی ہمیں پتہ ہے تمہارے ہاتھوں میں کتنا دم ہے۔" یہ میری پرانی چھیڑ تھی، چیزیں میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جایا کرتی تھیں۔ ہاتھوں میں تو گویا زور ہی نہیں تھا اور وہ میری پرانی واقف کار دوست تھی۔ اس سے میرے دل کی کوئی بات چھپی نہ تھی۔
اس کی بیماری کے دوران مجھ پر اس کی شخصیت کے بہت سے نئے پہلو کھلے۔ اس کا انتہائی صبر سے سر اٹھا کر اس موذی بیماری کا مقابلہ کرنا، اپنی ظاہری حالت کو جہاں تک ہو سکے بہتر سے بہتر رکھنا۔ اس کے کمرے کا دروازہ عموماً بند رہتا تھا۔ پہلے وہ کسی طرح اپنی حالت پر قابو پاتی اور پھر کسی کسی کو اپنے کمرے میں بلا لیتی۔ اس کی طرف سے اپنے نام کا بلاوہ اس وقت بھی مجھے ایک بے نام سی خوشی دے جاتا۔ ہم کافی دیر تک خاموش ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہتے۔ کہاں تو ایک دوسرے سے ملاقات میں خاموشی کا ایک پل کا وقفہ بھی نہ آتا تھا اور کہاں یہ وقت کہ دل میں ہزار ہا ان کہے قصے تڑپتے رہ جاتے لیکن ہر بات بزبان خاموشی کرنا پڑتی۔ گھر میں صبح شام دعاؤں اور وظیفوں کی ورد جاری تھے۔ اسے جب بھی کسی ڈاکٹر کے پاس یا ہسپتال جانا پڑتا وہ اپنا حال حلیہ اس طرح بہتر بنا کر نکلتی

کہ دیکھنے والا اس کی بیماری کی سنگینی کا اندازہ ہی نہ لگا سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے دل کی بیماری کے شروع ہی میں بتا دیا تھا کہ اس کے پاس گل دو سال ہیں۔ لیکن وہ ڈاکٹر کی ان باتوں سے ہراساں ہونے کے بجائے سب کی ڈھارس بندھایا کرتی تھی۔ دوسروں کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی ہمیشہ سے اس کا وطیرہ تھا۔ اس کے دل کا حسن اس کے چہرے پر بھی نمایاں تھا۔ جہاں جاتی اس کے اوڑھنے پہننے کا سلیقہ، اس کی من موہنی صورت لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا لیتی۔

ہم بچپن سے لے کر جوانی تک ایک ساتھ کھیلے، ہنسے، پلے بڑھے اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب ایک ہی سال میں ایک ہفتے کے فرق سے ہم دونوں کی شادیاں اپنی پسند اور والدین کی رضامندی سے طے ہو گئیں۔ موسم بہار کی پُر فضا دلفریب رُت تھی۔ اوائل اپریل کا شفاف نیلا آسمان۔ ہر طرف رنگا رنگ پرندوں کی صدائیں اور خوشنما گل بوٹوں کی قطاریں۔ ہوا میں جیسے ہار سنگھار اور بیلے کے پھولوں کی مہک رچی تھی۔ گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ نشی کی شادی سے ایک ہفتہ پہلے میری شادی ہونا قرار پائی تھی۔ مہندی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ ہر کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ اس گہما گہمی میں اچانک ایک صدائے جانکاہ گھر میں گونجی۔ ''کل رات تین بجے پھانسی دے دی گئی اسے۔ جس کے لیے منتیں مانی جا رہی تھیں اور لاش کو کسی کو دکھائے بغیر لاڑکانہ لے جا کر دفن کر دیا گیا۔''

یہ اعلان کیا تھا بم کا گولا تھا، زلزلہ تھا، طوفان تھا۔ صبح صبح جیسے تاریکی چھا گئی۔ ہنستے بولتے گھر میں سناٹا ہو گیا۔ ہر کوئی اپنا دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور یہ پُر ہول سناٹا صرف ہمارے گھر پر ہی نہیں بلکہ سارے شہر پر چھایا تھا۔ آنکھیں اشکوں سے لبریز ہو گئیں۔ لبوں پر خاموشی کی مُہر لگ گئی۔ کہنے سننے کو کچھ باقی ہی نہ رہا تھا۔ دل سے مانی جانے والی منتوں، مرادوں اور دُعاؤں کو یوں ہوا میں تحلیل ہوتے دیکھ کر ہر کوئی دم بخود تھا۔ شادی والے گھر کی فضا ہی تبدیل ہو گئی۔ سب کے کان بی بی سی ریڈیو کی طرف لگ گئے جہاں سے اس بارے میں خبر ملنے کی کچھ امید تھی کیونکہ ملکی میڈیا تو شدید ترین سنسر کی زد میں تھا۔ ریڈیو پر اعلان ہوا۔'' اور اب وہ آواز جو اب کبھی سنائی نہیں دے گی۔!!!''

شادی بھی ہوئی اور ولیمہ بھی لیکن سب کچھ پھیکا پھیکا تھا۔

میری شادی کے عین ایک ہفتے کے بعد طے شدہ تاریخ پر نشی کی شادی تھی۔ وہ دلہن بن کر

سسرال سدھاری۔ سب رسموں کی ادائیگی کے بعد رات بارہ بجے دلہن گھر میں داخل ہوئی اور صبح منہ اندھیرے دادی نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ شادیاں تو بخیر و عافیت ہو گئیں۔ نشی کا ولیمہ ملتوی ہو گیا۔ جو پھر کبھی وقوع پذیر نہ ہو سکا۔

اگلے چند ہفتوں بعد میں اور نشی بمع اپنے شوہروں کے نتھیا گلی کے لیے عازم سفر ہوئے۔ یہ ہماری زندگیوں کا یادگار سفر تھا۔ نتھیا گلی کے راستوں اور پہاڑوں پر برف کا راج تھا۔ شہری علاقوں میں ابھی گرمی پڑنا شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے لوگوں نے خال خال ہی پہاڑی علاقوں کا رُخ کیا تھا۔ نتھیا گلی کا یہ سفر ایک ایسے خواب کی تعبیر تھی جو میں نے اور نشی نے ایک عرصے سے اپنی آنکھوں میں بسا رکھا تھا۔ ہم ان پُر پیچ راہوں پر ہنستے گاتے، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ایک ساتھ گھومتے پھرتے۔ موسم حسین تھا۔ فرصت ہی فرصت تھی۔ دن بھر دھوپ اور چھاؤں کی آنکھ مچولی ہوتی رہتی اور راتوں کو دھواں دھار بارش ٹین کی چھتوں پر برس برس کر شور مچاتی۔ آتش دان میں آگ جلا کر ہم چاروں دنیا جہان کی باتیں کرتے، کہانیاں کہتے اور کارڈ کھیلتے۔ دن کے وقت کبھی کبھی یہاں پر ایسے جوڑے بھی نظر آتے جو گود میں بچے اُٹھائے پہاڑوں کے سائے تلے تصویریں کھنچوا رہے ہوتے۔ انھیں دیکھ دیکھ کر ہم خوب ہنستے اور ہمیں یہ منظر بہت اجنبی اور بہت ہی مضحکہ خیز لگتے۔ ہنسی تو جیسے کبھی لبوں سے دور ہوتی ہی نہ تھی۔

اس وقت ہمیں یہ خیال بھی نہ گزر رہا تھا کہ اسی سال کے اندر اندر ہم اپنے بچوں کو گود میں اٹھائے ان کی پرورش کے کٹھن مراحل میں اس طرح مصروف ہو جائیں گے کہ زندگی اس بے فکری سے ہنسنے کا موقع پھر کبھی نہیں دے گی جو اوائل اپریل کے اُن دنوں کا خاصہ تھی۔ اس ساری دلکشی اور مسرت کو دل میں سمائے ہم واپس اپنے شہر پہنچے اور یہ عہد کیا کہ زندگی میں ایک بار پھر ہم چاروں اکٹھے یہاں ضرور واپس آئیں گے۔ گو کہ یہ عہد پھر کبھی پورا نہ ہو سکا۔

اور پھر دن مہینوں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے اور نشی نے اپنا مستقل ٹھکانہ کراچی شہر کو بنا لیا اور میں لاہور ہی میں رہ گئی۔ اگرچہ ہزار ہا میل کی دوریاں ہمارے درمیان حائل ہو گئیں مگر ہمارے دلوں کے درمیان ایک انچ کی دوری کی بھی گنجائش نہ تھی۔ دور رہتے تو لمبے لمبے خطوں کے ذریعے ایک دوسرے سے

رابطہ برقرار رکھتے اور وہ جب بھی لاہور آتی ہم سب ضرور یکجا ہوتے اور زندگی میں جیسے بہار آجاتی۔ ہم جب بھی ملتے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ میں جب بھی کراچی جاتی دل یہ سوچ کر ہی خوشی سے اُچھلنے لگتا کہ اس شہر میں اس کا گھر ہے۔ دیکھنے والے اکثر متعجب ہوتے کہ وہ کون سا جذبہ ہے کہ ایک دوسرے سے ملنے پر ایسی خوشی بن کر ہماری آنکھوں سے جھلکنے لگتا ہے جیسے ہم نے کوئی خزانہ پالیا ہو۔

اس کی بیماری کی ابتدا تھی۔ ابھی اس کی سنگینی کا آغاز نہ ہوا تھا۔ اسی برس موسمِ گرما کی تعطیلات میں جب میں کراچی پہنچی تو نشی کو پورے جوش و خروش اور ولولے کے ساتھ اپنے ذاتی گھر کی تعمیر میں مشغول پایا۔ گھر کی چھوٹی سے چھوٹی چیز سے لے کر بڑی سے بڑی چیز تک کی خریداری میں وہ خود شامل ہوتی۔ ٹائلیں، کھڑکیوں میں لگنے والے چوکھٹے، شیشے، بلبوں کے شیڈ، فانوس دروازوں پر لگائے جانے والے مختلف ڈیزائن کے ہینڈل اور نجانے کیا کیا۔

''چلو نا میں تمھیں اپنا گھر دکھا کر لاؤں۔'' وہ بڑی خوشی سے بولی۔ اور ہم شوق سے اس کے زیرِ تعمیر مکان پر پہنچے۔ یہ مکان اپنے اندر بڑی کشادگی اور وسعت لیے ہوئے تھا۔ دیواریں ایستادہ ہو چکی تھیں۔ فرش پر روڑی پڑی تھی۔ کسی کسی کمرے کا فرش پڑ چکا تھا۔ کسی کی رگڑائی جاری تھی۔ زینہ بھی تکمیل کے آخری مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ ان سیڑھیوں پر بچتے بچاتے احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے ہم اوپر کی منزل میں داخل ہوئے۔

''بھئی یہ ہے ہمارا بیڈ روم۔'' اس نے با آواز بلند اعلان کیا۔

''واہ نشی۔ یہ تو بڑا زبردست ہے۔ اس کا ویو کتنا خوبصورت ہے۔ دائیں جانب کی کھڑکی سے کھلا آسمان دکھائی دیتا ہے۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں یہ میری فیورٹ کھڑکی ہے۔'' اس کی آنکھوں میں مستقبل کے سنہرے سپنے تھے۔

ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی بیماری کے بارے میں بھی ہنس ہنس کر بتاتی رہی۔ ''ارے بھئی اتنے ڈاکٹروں کو دکھایا ہے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں۔''

''تو تمھیں محسوس کیا ہوتا ہے؟''

''بس کیا بتاؤں، عجب شور سا رہتا ہے دل میں۔ اس دن میں قالین پر بیٹھ کر ذرا سی صفائی کرنے لگی برش سے۔ ایسا اڑم بڑھم دڑھم ہوا دل میں کہ میں تو ڈر ہی گئی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''افوہ بھئی۔ خیال رکھا کرو اپنا۔ تم تو کسی بات کو سنجیدگی سے لیتی ہی نہیں ہو۔'' میں

نے ذرا فکرمندی سے کہا۔

''ہاں ہاں۔ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

اس کی زندہ دلی نے زمانے کے حوادث سے آسانی سے گھبرانا کبھی نہ سیکھا تھا۔

اگلے دو برس تک میرا کراچی جانا نہ ہوا۔ اور اب اس کی بیماری اپنا پورا رنگ دکھا رہی تھی۔ روز بُری سے بُری خبر سننے کو مل جاتی تھی۔ یہ نشی کے بیماری کی شدت میں لاہور منتقل ہونے سے تین ماہ پہلے کا ذکر ہے۔

میں پرائیویٹ ماسٹرز کے آخری پرچوں میں الجھی ہوئی تھی۔ دل پڑھائی سے اُچاٹ ہو چکا تھا۔ بس نہیں چلتا تھا کہ کس طرح پرچے ختم ہوں اور میں اُڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ خدا خدا کر کے فارسی کا آخری پرچہ ختم کر کے گھر سے سامان اٹھایا اور سیدھی ائرپورٹ کے لیے روانہ ہو گئی۔

اگست کی ایک ملگجی سی شام کو میں کراچی پہنچی۔ شہر کی فضا میں دُکھ گھلا تھا۔ ہوا میں گہری اداسی کی مہک رچی تھی۔ ائرپورٹ سے دیا کو ساتھ لے کر بے تاب دھڑکتے دل کے ساتھ نشی کے نو تعمیر شدہ متعدد روشنیوں سے جھلملاتے ہوئے بنگلے میں داخل ہوئی۔

خوبصورت چمکدار ٹائلوں والے فرش، جدید ساز و سامان سے آراستہ راہداریاں اور نشست گاہیں، نفیس پردے۔ ان سب پر ایک سرسری نظر دوڑاتی، کشادہ سیڑھیاں طے کر کے بالائی منزل پر پہنچی۔ سامنے نشی کی خواب گاہ تھی۔ بے تابی اور سُرعت سے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

نشی اپنے آراستہ پیراستہ بیڈ روم میں اپنے نرم و دبیز بستر پر شدید بیمار پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر موت کے ظالم پنجوں کے سائے لہرا رہے تھے۔ گو اس کی آنکھوں میں اب بھی امید کے چراغ روشن تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی شہزادی کسی الف لیلوی محل میں کسی انجانے جادو کے زیر اثر بے یار و مددگار اور بے بس پڑی ہو۔

ڈاکٹر نے اسے بولنے سے بھی منع کر رکھا تھا کہ زیادہ بولنے کی اس کے دل میں طاقت ہی نہ تھی۔ میں نے اسے پیار کیا، اس سے چند باتیں کیں اور بے قرار ہو کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ آنسوؤں کی برسات آنکھوں کے بند توڑ کر بہہ نکلنے پر تلی ہوئی تھی۔ میں اندھا دھند اس کے خوابوں کے محل سے نکل کر نیچے شام کے نیم تاریک دھندلکے میں لان میں رکھی ہوئی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔

☆☆☆☆☆☆

پارسائی

تم
تم جس خواب میں آنکھیں کھولو
اس کا روپ امر
تم جس رنگ کا کپڑا پہنو
وہ موسم کا رنگ
تم جس پھول کو ہنس کے دیکھو
کبھی نہ وہ مرجھائے
تم جس حرف پہ انگلی رکھ دو
وہ روشن ہو جائے

مہینوں سے اس کے موبائل پہ ایسے ہی پیارے ایس ایم ایس آرہے تھے وہ پڑھتی جاتی تو لب مسکراتے جاتے اور دل تو بالکل ہاتھوں سے ہی نکلا جارہا تھا۔ آپ ہی آپ مور بن کے ناچتا رہتا وہ سمجھاتی کہ پاگل گھر والوں نے مجھ پہ اعتبار کر کے موبائل لے دیا ہے۔ سب بہت پیار کرتے ہیں مجھ سے۔ میری دیر سویر سے پریشان ہو جاتے ہیں تو دل کھلکھلا کے ہنس پڑتا ''ذرا سی خوشی تو ہے یہ خوبصورت سا احساس مجھے جینے دو، مجھے جینے دو دل لجاجت سے اٹھلانے لگتا تو وہ ہار جاتی اور ایک ایک لفظ پھر پڑھنے لگتی۔ رگ وپے میں سکون اترتا جاتا۔ چاہے جانے کا احساس اسے اپنے اطراف سے بے گانہ کر دیتا تو وہ پھر کہتا:

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے

آمنہ ابھی کتنا کام باقی ہے بیٹا'' امی تو لیے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی اس کے پاس آبیٹھیں تو وہ مسکراتی ہوئی ان کے قریب چلی آئی اور ہاتھ پکڑ کر بولی۔

''بس چند ماہ' پھر آپ کی بیٹی پوری مصورہ بن جائے گی'' ''ویسے کیوں؟''

''آمنہ میں چاہتی ہوں اسد اور احمد کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی وداع کر دوں۔ بیٹا میں نے اور تمہارے بابا نے بہت ہی لاڈ اور پیار سے تمہیں پالا ہے ہمیشہ تمہاری ہر خواہش ہر خوشی پوری کی ہے۔ بھائی بھی بہت چاہتے ہیں تمہیں۔ اس لیے گھر میں بھابیاں آنے سے پہلے پہلے میں تمہیں رخصت کر دینا چاہتی ہوں۔ اپنا اپنا سوچنے کا نظریہ ہے ناں۔ بس میں چاہتی ہوں میری بیٹی سے کسی کو کوئی اختلاف نہ ہو۔ کوئی اسے بوجھ نہ سمجھے' بس

ثمینہ سیّد

ذرا سی بات ہے مگر---"

"امی تو اس میں اتنا دلگرفتہ ہونے کی کیا بات ہے؟"

"جیسے مرضی کریں آپ بس ذرا ہم سے بھی رائے لے لیجیے گا۔"

آمنہ اُٹھتے ہوئی اٹھلائی تو زینت مسکرا دیں اپنی موہنی سی بیٹی کو دیکھ کر۔

وہ دلنواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
مرا علاج مرے چارہ گر کے پاس نہیں

آمنہ نے مسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا جیسی تھرتھراہٹ ایس ایم ایس کے آنے سے موبائل میں ہوتی تھی بالکل ویسی ہی تھرتھراہٹ تو اس کے پور پور میں سمانے لگتی تھی۔

وہ دیر تک لفظوں پہ نگاہیں ٹکائے رہی اور پھر دوسرے ہاتھ سے برش رکھ کر ذرا فاصلے پہ پڑے صوفے پہ جا بیٹھی۔

"تو کیا علاج کیا جائے آپ کا؟" اس نے جواباً ایس ایم ایس کیا۔

آج مہینوں بعد پہلی بار مختصر سا جواب دے کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ دل پسلیوں سے باہر آنے کو بے تاب تھا۔

تو بدگمان ہے میری وفا پہ صرف ایک بار آزما لے
جو ہار جاؤں تو لوٹ جانا جو جیت جاؤں تو مان جانا

پھر لفظ ناچ رہے تھے محبت کے ساز پر۔ تو اس نے بے بسی سے لفظوں کو دیکھا اور بار بار پڑھ ڈالا۔

"تجھے کیا ہو گیا ہے میں تو سامنے بیٹھے کسی شخص سے متاثر نہیں ہوتی پھر اب کیا ہو رہا ہے" اس نے خود کو ڈانٹا۔ ایک بالکل ہی انجانی اور غیر یقینی کیفیت اس پہ غالب ہوتی جا رہی تھی تبھی اس نے ہار مان لی اور ماں کے پاس چلی آئی ابھی بیٹھنے ہی لگی تھی کہ پھر تھرتھراہٹ نے آنکھیں نم سی کر دیں اس نے دھندلی آنکھوں سے موبائل کو دیکھا۔

سب دعاؤں میں یہی حرف اثر پیارا لگے
عمر بھر چاہوں تجھے تو عمر بھر پیارا لگے

....

اس نے ماں کے سامنے موبائل کر دیا۔ "کلیم حیدر ایم بی اے کیا ہوا ہے"

زینت آراء نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل پکڑا وہ لمحوں میں آگہی کی تمام منزلیں طے کر گئیں۔ ماں جو تھیں یہ رشتہ ہی ایسا ہے نبض شناس اولاد کی رگ رگ سے واقف' تصویر پر کچھ پل نگاہیں ٹکائے رہیں۔

"تصویر تو اچھی ہے مگر ضروری تو نہیں اسی کی ہو یہ بھی ضروری نہیں وہ ایم بی اے ہو اور یہ بھی تو ضروری نہیں ناں میرا بچہ-- کہ وہ کلیم حیدر ہو یہ سب محض جھوٹ' فراڈ بھی تو ہو سکتا ہے" ماں کے لہجے میں اندیشے ہی اندیشے سنسنا رہے تھے۔ "ماں پلیز! ڈرائیں ناں" آمنہ قریب ہو کر بیٹھ گئی مگر دل اس شخص سے دستبردار ہونے کو تیار ہی نہ تھا وہ کچھ پل کھوئی کیفیت میں رہی اور پھر سنبھل سنبھل کر بولی۔

"ماں ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے جیسے سب جھوٹ' فراڈ یا وہ بہترین انسان بھی ہو سکتا ہے۔ یہی خالہ اور رحمان انکل کی طرح۔ وہ بھی تو نیٹ

پہ ملے تھے ناں اور آج ہمارے سامنے ایک بھرپور زندگی گزار رہے ہیں اور واہے' ڈر' اندیشے تو ہر صورت ہوتے ہیں ناں۔ ماں جب ہم نئے لوگوں سے رشتہ جوڑتے ہیں جیسے بینا پھوپھو کو دیکھیں دادا ابو نے حسب نسب' خاندان' تعلیم' شرافت سب دیکھا' جانچا تھا ناں پھر بھی ان دونوں کی نہ بن سکی تو؟''

''تو تم چاہتی ہو ہم اسے بلائیں' دیکھیں اور اگر سب تمہاری سوچ اور امیدوں کے برعکس ہوا تو؟'' زینت آراء نے ساری بات سمیٹ کر اسی پر چھوڑ دی تو وہ اپنی لانبی گھنی پلکیں جھپکا کر لاڈ سے بولی ''پتا نہیں پھر۔۔۔ ماں پلیز یوں اکیلے میں فیصلہ نہیں کر سکتی میں۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے''۔

''اچھا! اسے کہو اپنے پیرنٹس کو بھیج دے''۔ زینت آراء نے مضبوط دل کے ساتھ فیصلہ سنا دیا اور پھر رات کو ہی اپنے میاں ظفر خان اور بیٹوں کو بتا دیا کہ ان کی کسی دوست کی وساطت سے ایک رشتہ آرہا ہے باقی چھان بین آپ لوگ کر لینا۔ یہ سب تو دنیاداری کے تقاضے تھے جو انسان کو مرحلہ وار پورے کرنا ہی پڑتے ہیں ورنہ جوڑے تو آسمانوں پہ بن چکے ہوتے ہیں اور یہ رشتہ بھی تقدیر کے قلم سے رقم ہو چکا تھا۔ تبھی وہ سب مراحل کے بعد آمنہ کلیم بن کر کلیم حیدر کی زندگی میں شامل ہو گئی۔ ان دونوں کا جوڑ اس قدر خوبصورت' مکمل' تعلیم یافتہ اور ایک دوسرے پہ جان لٹانے والا تھا کہ آمنہ اور اس کی پیاری ماں کے سب وسوسے دم توڑ گئے۔ آمنہ کو تو لگتا زندگی سب کے لیے محبت ہی محبت ہوتی ہے۔ خوشی ہی خوشی لوگ بے وجہ شکوے کرتے ہیں بھلا وہ خالق' رب کریم جو پالنہار ہے کسی کو دکھ کیوں دے گا؟ مگر وہ دکھ دیتا ہے۔

دکھ دے کر انسان کے حوصلے اور صبر کو آزماتا ہے۔ آخر انسان کے دنیادار دل کو مومن بھی تو کرنا ہوتا ہے۔ جس کے لئے آزمائش شرط ہے۔

''آمنہ تم نقاب کیوں نہیں کرتیں؟'' کلیم اس کے پاس آ کے بولا

یہ سوال اس کے دل میں بہت دنوں سے مچل رہا تھا۔ آمنہ مسکراتی رہی وہ چھلکتی آنکھوں سے اس کی لمبی لمبی سیاہ آنکھوں اور گلابی گالوں کو دیکھ رہا تھا۔ ''بولو ناں'' وہ ساحر سے لہجے میں بولا تو وہ کھلکھلا دی۔

''ضروری نہیں تمہیں پیاری لگتی ہوں تو سب کو لگوں۔ وہ اٹھلا کر بولی۔

''ویسے کبھی کیا ہی نہیں'' ''اور تم کہو تو کر لوں گی'' وہ اسی طرح اٹھلا کر بولی تو کلیم نے فوراً کہا ''آئندہ تم نقاب کر کے نکلنا او کے''

''او کے'' آمنہ نے کندھے اچکائے تو وہ اس کے ہاتھ چوم کر بولا ''آئی لو یو سو مچ سویٹ ہارٹ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ''

''وضاحتوں کی ضرورت نہیں کلیم حیدر'' وہ ادا سے بولی

آمنہ شادی کے بعد گھر سے باہر جاتی ہی نہ تھی' اسے لگتا اس کی چھوٹی سی جنت میں تمام سکھ ہیں' تمام تر خوشیاں۔ کلیم کی ماں

جی کو شہر میں رہنے کی عادت نہ تھی وہ واپس گاؤں چلی گئیں۔ کلیم حیدر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں مارکیٹنگ منیجر تھا۔ آمنہ کے والدین بھی بہت مطمئن تھے۔ بس بیٹی کے کم آنے کا شکوہ کرتے مگر اسے خوش دیکھ کر خوش ہو جاتے' پرسکون ہو جاتے۔

آمنہ کو جو چاہیے ہوتا کلیم گھر لے آتا' یہاں تک کہ کپڑے اور جوتے دکاندار گھر لاتا' آمنہ کو پسند کروا کے لے جاتا اور پھر کلیم حیدر خود لے آتا۔ کھانے پینے کے سب سامان کی فراوانی کیے رکھتا۔ کام کرنے والی عورتوں پر اسے اعتبار نہیں تھا تو آمنہ بھی بہت پیار سے سب کچھ خود کرتی رہتی۔ وہ آفس جاتے ہوئے باہر سے تالا لگا جاتا۔

''جان میں لاک کر جاتا ہوں تم ریسٹ کرو تم کیوں تکلیف کرتی ہو'' وہ کہتا اور آمنہ اپنی خوش بختی پہ نازاں تکیوں میں منہ دے کر سو جاتی۔ کلیم حیدر کا وجیہہ سراپا بھی چھم سے آنکھوں میں اتر آتا۔ مسکراہٹ ہونٹوں سے الگ ہی نہ ہو پاتی۔

تبھی کلیم کو کمپنی کی طرف سے آسٹریلیا جانے کی آفر ہوئی۔ آمنہ تو بہت خوش تھی ''کلیم زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے' اچھا ہے ناں ایک چانس ملا ہے اسے انجوائے کرو لوٹ کر تو گھر ہی آنا ہے ناں'' وہ اس کی بے بس سی صورت دیکھ رہی تھی۔

''مگر میں تمہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟''

''جیسے روز جاتے ہو باہر سے لاک کر جانا''

وہ قہقہہ لگا کر ہنستی ہوئی قریب چلی آئی مگر کلیم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''تمہیں پتا ہے آمنہ انسان اپنی ابتدا سے ہی محبت کے معاملے میں غیر محفوظ تصور کرتا ہے خود کو۔ جب تک اسے ''تیرے اور میرے'' کی پہچان نہیں تھی تب تک تو ٹھیک تھا مگر پھر محبت نے آگہی بن کر دلوں میں درزیں بنانا شروع کر دیں۔ انسان نے اپنی پسند کے رشتوں کو اپنانا شروع کر دیا۔ پھر عزت واحترام کے پیمانے بنائے گئے گھر اور چاردیواری کا تصور اٹھ کے آیا تو محبت نے ذرا سی سکھ کی سانس لی۔ انسان کو عجیب طرح کی خوشی اور غرور گھیر لیتا ہے۔ ایسی جب وہ یہ لفظ بولتا ہے ناں میرا گھر' میرے بچے' میری بیوی' میرے ماں باپ' میرے اپنے' تو وہ خود پر نازاں ہوتا ہے' بہت خوبصورت سے احساسات جڑے ہیں ان رشتوں کے ساتھ''۔

''ہاں مگر بھروسہ بھی ضروری ہے۔ کلیم جیسے ہم دونوں کے درمیان محبت ہی محبت ہے اور محبت بھروسے کے بغیر کچھ بھی نہیں تم جلدی آؤ یا دیر سے کہیں بھی جاؤ' کیسا بھی کپڑا پہنو' کوئی تمہارے بارے میں کچھ بھی کہے' مجھے سنائی ہی نہیں دیتا۔ بس محبت دائرہ بنا لیتی ہے' میرے گرد تمہارے لفظ' تمہارے لہجے' تمہارا پیار' تمہارا ساتھ ہی ضروری ہے' میرے لیے'' وہ رکی ''اور یقیناً تمہارے لیے بھی'' دیکھو ہم دونوں بالکل انجان تھے مگر اب اسی محبت اور اسی اعتماد کی وجہ سے ہی ایک ساتھ ہیں نا؟'' وہ جانے کیوں شرمندہ سا ہوا لیکن وہ اپنی لہر میں بولتی رہی۔

''پرانے زمانوں میں مرد کہیں باہر جاتے تھے تو اپنی بیوی کو لوہے کا لباس پہنا کر بھاری تالا لگا دیتے اور چابی ساتھ لے

جاتے" وہ ہنسی تو جلترنگ سے بجنے لگے کلیم حیدر چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ مرد کی محبت کی شدت ہی تو تھی" وہ بولا تو آمنہ پہلی بار بری طرح چونکی۔

"کلیم یہ محبت نہیں تھی بے اعتباری تھی' محبت محض جسم کا رشتہ نہیں ہے۔ مرد اگر عورت کا دل محبت سے باندھ نہ پائے تو پھر ممکن ہی نہیں وہ عورت کو کسی بھی کام سے روک سکے۔ آدم اور حوا کی اس کائنات میں رشتوں کے لیے محبت کا لاک ہی کافی ہے۔ جناب" آمنہ نے پیار سے اس کے بال بگاڑے تو وہ مسکرا دیا "اچھا چھوڑو بہت بھوک لگی ہے" کلیم نے بات ختم کی مگر بات یہیں ختم نہیں ہوئی وہ سائے کی طرح آمنہ کے ساتھ تھا۔ دونوں نے اس کے جانے کے لیے شاپنگ کی۔ آمنہ نے اپنے لیے رنگ برش اور کینوس خریدے۔ کلیم نے پاگلوں کی طرح گھر میں راشن بھر دیا تھا کہ موبائل کارڈز بھی ڈھیروں کے حساب سے لے دیئے "میری جان کو ذرا سی بھی تکلیف نہ کرنا پڑے" وہ مسکرایا اور جاتے جاتے بولا "ہر لمحہ رابطے میں رہنا جب بات نہ کر سکو تو ایس ایم ایس کرتی رہنا مگر پلیز دیر نہ کرنا" وہ لاڈ سے بولا تو آمنہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پھر صبح وشام گزرنے لگے۔ وہ رات دیر تک بات کرتا جب آمنہ نیند سے بے حال ہو جاتی یا کبھی کبھی تو بات کرتے کرتے سو جاتی تو کلیم حیدر کو سکون ملتا۔ دن بھر چلتے پھرتے' کھاتے پیتے' پینٹنگ بناتے وہ مسلسل اس سے رابطے میں رہتی' وہ تھی ہی سدا کی مست الست لوگوں سے تعلقات کا خاص شوق بھی نہ تھا اسے۔ امی ابا جان مل جاتے' بھائی اور بھابیاں بھی مل جاتے' اسے آنے پر مجبور کرتے رہتے مگر وہ ہنس کر ٹال جاتی۔

"مجھے کلیم کے بغیر آنا اچھا نہیں لگتا بس وہ آئیں پھر آؤں گی۔"

تنہائی اور یکسوئی ملی تو اس کے اندر کا آرٹسٹ نکھر کر سامنے آ گیا۔ بہت سی شاہکار تصویریں بنا کر وہ محبت سے دیکھتی رہتی۔

"کلیم تم تو دیکھ کے حیران رہ جاؤ گے اپنی زوجہ محترمہ کے کارنامے"

"تم آؤ گے تو ایگزی بیشن کی تیاری کریں گے"

"کلیم من میں محبت کی روشنی ہو تو رنگ کیسے زندہ اور خوبصورت سانچوں میں ڈھلتے جاتے ہیں یقین کرو میں اداس شجر بناتی ہوں تو رنگ میرے اندر سے ہریالی لے کر سبز پتے بنا دیتے ہیں' سرخ کونپلیں بن جاتی ہیں"۔ وہ ہنستی چلی گئی۔

سامان ضرورت کم ہونے لگا اس نے سوچا لے آئے گی اور شہلا درانی سے بھی ملے گی' باقی سب دوستوں سے بھی ملنا چاہ رہی تھی "معاشرے میں اپنی جگہ بنانے کیلئے مجھے اس محبت گاہ سے ذرا باہر تو جانا ہی پڑے گا" آمنہ نے انگلی پر اپنی لٹ گھماتے ہوئے سوچا اور چادر اوڑھ کر گیٹ عبور کر آئی' مہینوں بعد گھر سے باہر قدم رکھا تھا' اسے لگا ساری دنیا اسے ہی دیکھ رہی تھی "شاید میرا

وہم ہے'' وہ مسکرائی اور پی سی او میں چلی آئی ''ایک ٹیلی نار کارڈ اور وارد کی ایک سم بھی دیجئے گا'' اسے لگا دکاندار نے ''اوہو'' کیا ہے بڑی معنی خیزی سے۔ مگر کیوں کیا ہو گیا۔ شاید لوگ سمجھ رہے ہیں اکیلی لڑکی' بیچاری نئی نئی آئی ہے۔ اس علاقے میں'' وہ سوچ کر مسکرائی اور پھر بہت سے ادھورے کام پورے کر کے آج گھر لوٹی تو اچھا لگ رہا تھا صوفے پر سر ٹکا دیا۔

''ابھی تو اتنا سب کچھ کلیم کو بھی بتانا ہے۔ شہزادی --ابھی سے تھکنے لگی ہے؟'' وہ زیر لب بڑبڑائی اور آنکھیں موند کر صوفے کی پشت پہ سر ٹکا دیا۔ تبھی موبائل کی بپ بجی اور دھڑکنیں بھی مست ہونے لگیں۔

''جی جناب' کیسے ہیں آپ؟'' وہ چہکی۔

''تم نے دو تین سمیں کیوں خریدیں اور لبرٹی لفٹ سے اترنے کے بعد کہاں گم رہیں؟'' کلیم حیدر کا صبر جواب دے چکا تھا۔ وہ چلا کر بولا تو آمنہ ایکدم چونکی' سیدھی ہو بیٹھی' اس کے موڈ کا اندازہ لگانے لگی۔

''تم آ چکے ہو؟ مجھے سرپرائز دے رہے ہو؟'' آمنہ کا پور پور بے تاب ہوا تو کلیم حیدر جیسے ہوش میں آ گیا۔ ''بہت برے ہو تم میرے جادوگر آتے ہی بیوی کے تعاقب میں لگ گئے' اب کہاں ہو جلدی بولو' آمنہ چہک چہک کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی' چلتی چلتی دروازے تک بھی آ گئی وہ چپ تھا ''کلیم کہاں ہو؟'' وہ چلائی تو وہ بمشکل لفظوں کو ترتیب دے کے بولا ''ابھی کچھ دن اور لگیں گے'' کلیم کی آواز کے ساتھ ہی آمنہ کے اندر بہت کچھ ٹوٹا' اعتماد' محبت' وفا اور پارسائی جیسے شاید اس نے کلیم کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے پامال کیا تھا یا محبت کا جرم کر کے یا پھر محبوب سے شادی کر کے یا پھر محبت سے وفا کر کے یا پھر وفا کو عبادت مان کر یا پھر عبادت پر مغرور اور پرسکون رہ کر اسے چلاتے چلاتے بہت سی باتیں یاد آنے لگیں۔ پی سی او والے کی نظریں' کالونی کے چوکیدار کی پوچھ گچھ' خود ہی ٹیکسی رکنے کی چرچراہٹ' ٹیکسی ڈرائیور کی نگاہیں اور واپسی پر ہر مرد و عورت کی نگاہیں تو دیواریں' ریت' مٹی' لوگ' باتیں اور کلیم کا محبت کی ''ذمہ داری'' سینکڑوں لوگوں کو سونپ جانا۔ سب کچھ روتی' چلاتی' نفرت کرتی آنکھیں بن جاتا اور آنکھیں اسے گھورتی رہتیں' محبت ختم ہونے سے زیادہ اعتماد مرنے کا غم تھا۔ ''فاؤنٹین ہاؤس'' کی دیواریں بھی اسے چین نہ لینے دیتیں' وہ چلاتی رہتی آنکھیں زور زور سے ہنستیں دیواروں پہ شکلیں بنتیں اور سارے چہرے اس کا منہ چڑاتے۔

''میں دیدۂ عبرت نگاہ ہوں'' ''مجھے دیکھو'' ''میں پارسا نہیں ہوں'' ''میں پارسا نہیں ہوں'' وہ ہر کسی سے کہتی پھر انگلیوں پر پل گنتی جاتی ''کلیم نے آنا ہے ناں'' وہ سب اردگرد والیوں کو بتاتی اور پھر رونے لگتی ''وہ مر گیا' میری شدید محبت کے باوجود'' وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو ہتھیلی کی پشت سے رگڑتی اور پھر سب کو بتاتی ''محبت بھی مر گئی ہے آ جاؤ روئیں'' سب اس کے گرد جمع ہو جاتیں تو وہ بین کر کے اپنے اپنے غم روتی رہیں۔

☆☆☆☆☆

سوجی والے بسکٹ

شام ہوتے ہی اس منحوس پرندے کی غاں غاں کی آواز پھر سنائی دینے لگی ہے۔ لگتا ہے کہ وہ کئی دنوں سے اپنے کسی پرانے ساتھی کو تلاش کرتے کرتے اور آوازیں دیتے دیتے تھک گیا ہے۔اس کی پتھریلی غاں غاں کی آواز کبھی غاؤں غاؤں اور کبھی غیں غیں میں بھی بدل جاتی ہے۔اس بے نام پرندے کی افسردہ آہ و زاری نے ہمارے گھر پر بھی افسردگی کی بے کیف چادر اوڑھ رکھی ہے۔ دادی اماں لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے صحن کے کونے میں پڑے تخت پوش کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑائیں، ''بڈھا خبیث مر کر بھی ہماری جان نہیں چھوڑ رہا۔'' دادی جان کو مرحوم پروفیسر نہ جیتے جی پسند تھے اور نہ مرنے کے بعد دادی ان کو بخشنے کو تیار تھیں۔

ہمارے اور پروفیسر حبیب الدین کے گھر کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔ دیوار کے اس پار ویرانی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ لیکن شام ہوتے ہی اس ان دیکھے پرندے کی فریادیں خاموشی کو توختم کر دیتیں لیکن ایک عجیب قسم کی اداسی، خوف اک بے کیفی کے ملے جلے جذبات ازخود جنم لے لیتے۔ انگور کی بیل جو گرمیوں میں سبز کچور پتوں سے بھری ہوئی تھی اب جا بجا برہنہ ہو چکی تھی۔ جب سے ٹھنڈی سرد ہوائیں چلنا شروع ہوئیں اس خاموش مکان کو زرد سوکھے پتوں نے اپنا نشیمن بنا لیا۔ میں نے ایک عجیب بات محسوس کی تھی کہ جب اس پرندے کی چیخیں شام کو بلند ہوتیں خشک پتوں کا شور اور رقص تھم جاتا۔ ہم اپنی چھت پر نگاہوں کے مختلف زاویے بنا کر اس پرندے کا کھوج لگانے کی کوشش کرتے لیکن وہ ہمارے لئے ایک بھید ہی رہا۔

یہ مکان تین بڑے بڑے بلند چھتوں والے کمروں، ایک تاریک برآمدے، اور اندھے باورچی خانے پر مشتمل تھا۔ ایک کونے میں گھنا چھتناور شہتوت کا درخت تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ پروفیسر حبیب نے کیاری بنا رکھی تھی۔ جس میں مختلف پھولدار پودوں کے ساتھ کدو کی ایک بیل دیوار کے ساتھ چڑھی ہوئی تھی جب اس پر کدو لگتے تو انکل بابو اس کا حلوہ بناتے اور

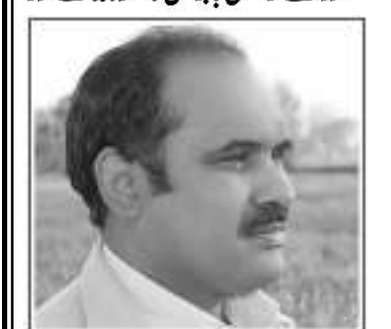

وقار احمد ملک

محلے کے بچوں کو بلا کر ایک چھوٹی سی دعوت کا سماں پیدا کر دیتے۔ محلے کے سارے بچے پروفیسر حبیب کو انکل بابو کے نام سے پکارتے تھے۔

ہم ساتھ والی گلی کا مکان فروخت کر کے جب پروفیسر حبیب کے ہمسایہ بنے تو ان کا گھر آباد تھا۔ بیوی تو ان کی فوت ہو چکی تھی لیکن ان کے بیٹے اور بیٹیاں ان کے پاس تھے۔ ہر وقت شور وغل اور طوفان بدتمیزی مچا رہتا۔ سونے پر سہاگے کا کام پروفیسر کی پھٹ پھٹی موٹر سائیکل کر دیتی۔ جب ان کی یہ شاہی سواری جو جدت اور قدامت کا حسین امتزاج تھی۔ گلی میں داخل ہوتی تو ایک کہرام مچ جاتا۔ یوں لگتا ہم اپنے گھروں میں نہیں موت کے کنویں میں بیٹھے ہوں۔

پروفیسر صاحب کو محلے کے بچے انکل بابو کے نام سے پکارتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انکل بابو کے گھر کا شور آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ بیٹے تلاش رزق میں دور دور بکھر گئے۔ اور بیٹیاں پیا دیس سدھار گئیں۔ پروفیسر صاحب کو اپنی چھوٹی بیٹی فریحہ سے بہت انس تھا۔ جب ہم اس مکان میں شفٹ ہوئے تو فریحہ پانچویں میں پڑھتی تھی۔ انکل بابو اکثر اپنی پھٹ پھٹی پر فریحہ کو سیر کراتے۔ باپ بیٹی دونوں اکثر جمیل بیکری پر جاتے اور سوجی والے بسکٹ خرید لاتے۔ یہ بسکٹ فریحہ کو بہت پسند تھے۔ میں چھت سے دیکھتا تو وہ شہتوت کے درخت کے نیچے بنے ہوئے چبوترے پر سوجی والے بسکٹ چائے میں ڈبو ڈبو کر بڑے مزے سے کھا رہی ہوتی۔ فریحہ کی معصومیت اور کھانے کے انداز کو دیکھ کر ان نو دولتیوں پر ہنسی آتی جو بسکٹ چائے میں ڈبو کر کھانے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ وہ معصوم تو معاشرت کے ان جدید طور طریقوں سے ناآشنا اپنا کھانا پینا جاری رکھتی۔ انتہائی محویت کے باوجود کبھی کبھی سوجی والا بسکٹ اس کے چائے کے پیالے میں گر پڑتا۔ یہ چونکہ روز کا معمول تھا اس لیے وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا چمچ لے کر بیٹھتی تاکہ چائے میں ڈوبے بسکٹ کو آسانی کے ساتھ نکال سکے۔ فریحہ پروفیسر صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ جس دن فریحہ پیلے ہاتھوں کے ساتھ حیدر آباد روانہ ہوئی تو پروفیسر صاحب اس گھر کے تنہا مکین رہ گئے تھے۔ شروع میں جب وہ اپنی بھونڈی آواز میں زور سے گنگناتے تو مجھے بڑا غصہ آتا۔ کالا چہرہ، موٹا ناک، سوجے ہوئے ہونٹ، کھچڑی بال اور اوپر سے مدھو بالا کے رومانوی گیت ------ توبہ توبہ۔

گانوں کے علاوہ وہ کبھی شیکسپیئر کے کرداروں کی طرح خود کلامی میں بھی مصروف ہو جاتے۔ اکیلے میں بھی ایسے زور زور سے باتیں کرتے جیسے کسی جلسہء عام سے خطاب کر رہے ہوں۔ ان کی آواز سن کر تو دادی اماں کا میٹر گھوم جاتا۔ پروفیسر کی

خودکلامیاں تو ختم ہو جاتیں لیکن دادی اماں کی بڑبڑاہٹ گھنٹوں جاری رہتی۔ وہ اکثر یہ کہتیں کہ نہ جانے اس کالے کھوسٹ کو پروفیسر کس نے بنا دیا۔

گرمیاں زوروں پر تھیں۔ ہم اپنے گھر میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اچانک میں نے ایک شاٹ کھیلا اور گیند انکل بابو کے گھر جا گری۔ برآمدے کے ساتھ والے کمرے میں انکل بابو ریت بچھا رہے تھے۔ میں گیند اٹھانے ان کے گھر آیا تو میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ فریحہ آنے والی ہے۔ اس کے بچے چھوٹے ہیں۔ حیدر آباد کے مقابلے میں میانوالی کی گرمی زیادہ ہے۔ اسلئے اس کمرے میں ریت بچھا کر پانی کی دو تین بالٹیاں ڈال دوں گا جس سے پنکھے کی ہوا ٹھنڈی ہو جائے گی۔

تنہائی میں وہ اکثر گرمیوں میں صحن کے درمیان میں سوتے اور رفیع اور لتا کے شاہکار گیتوں کا ستیاناس کرتے ان کی رات گزر جاتی۔ اکتوبر تک وہ باہر سوتے اور مارچ کے اوائل میں ہی باہر نکل آتے۔ شاید پرانے اور بوسیدہ کمروں کی خاموشی انہیں سونے نہ دیتی۔ سردیوں کی طویل راتیں وہ گلی سے ملحق کمرے میں گزارتے۔ اکثر گلی میں سے گزرتے ہوئے راہ گیروں کو ان کے بولنے کی آوازیں صاف سنائی دیتیں۔ دن کو وہ اکثر موٹی موٹی کتابیں پڑھنے میں گزار دیتے۔ چند دنوں سے ان کی طبیعت ناساز تھی اور ان کی خود کلامیاں بھی ماند پڑ گئی تھیں۔ وہ اپنی پھٹ پھٹی بڑی مشکل سے باہر نکالتے اور اس سے بھی زیادہ مشکل سے گھر کے اندر لاتے۔ جس دن فریحہ نے آنا تھا وہ بڑی تیزی میں تھے۔ حالانکہ وہ گزشتہ چند دنوں سے بیمار تھے اور بہت کمزور ہو گئے تھے۔ کھانسی کا دورہ پڑتا تو ختم ہونے کا نام نہ لیتا۔ صبح سے انتظار کرتے کرتے دوپہر اور پھر شام ہو گئی۔ مغرب کی اذانوں کا وقت تھا جب فریحہ اپنے بچوں کے ساتھ پہنچ گئی۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ان کے جسم کی لرزاہٹ سے یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ پچھلے دنوں کی بیماری تھی یا بیٹی کی آمد کی خوشی۔ تھوڑی دیر بعد کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ بچے نانا کی گود سے نکل کر بھاگے اور ماں کی گود میں پناہ لی۔ فریحہ خود حیرت، پریشانی اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اپنے باپ کو تک جا رہی تھی۔ پروفیسر کی آنکھ، ناک اور منہ سے اندر کا گند باہر نکلنے لگا۔ یہ کراہت آمیز منظر دیکھ کر بچوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ اس بات کا پتہ انکل بابو کو نہ چل سکا۔ طبیعت بحال ہوتے ہی انہوں نے اپنی پھٹ پھٹی نکالی اور مجھے آواز دی۔ پیار سے وہ مجھے قارو میاں کہتے تھے۔ قارو قارو کی آوازیں سن کر میں باہر نکلا تو انہوں نے مجھے موٹر سائیکل پر بیٹھنے کو کہا۔ ان کی بیماری اور کمزوری کو دیکھ کر میں نے بہانہ بنانا چاہا۔ لیکن نہ جانے کیوں

میں انکار نہ کر سکا۔ میں بازار سے گزر کر ہم سیدھے بینک والی گلی میں پہنچے۔ انہوں نے موٹر سائیکل جمیل بیکری کے سامنے کھڑی کر دی۔ بیکری میں انڈیا سے آئے ہوئے روایتی وضع قطع میں ہمیشہ کی طرح چاق وچوبند بزرگ موجود تھے۔ اس چھوٹی سی بیکری کے مالک بھی وہ خود تھے، بیکر بھی اور سیلز مین بھی۔ نیچے دلی کا کھلا پاجامہ، کڑھائی والا کرتا، کھرچے ہوئے دانتوں کے بیچ پان کی موجودگی ایک عجیب تاثر پیدا کر رہی تھی۔ پروفیسر صاحب نے جب اس کو سوجی والے بسکٹوں کا آرڈر دیا تو میں نے سوچا کہ فریحہ اب کوئی بچی تو نہیں رہی کہ وہ آج بھی اس کے لئے بچپن کے پسندیدہ بسکٹ خرید رہے ہیں۔ بیکر نے بڑی نفاست سے دو دو بسکٹ اٹھا کر لفافے میں ڈالے، ایسے جیسے وہ بسکٹوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ پروفیسر صاحب نے بسکٹوں والا لفافہ پکڑا تو ایک عجیب قسم کی خوشی ان کے کالے چہرے پر چھا گئی۔ ان کے کالے چہرے پر مسکراہٹ انتہائی کریہہ دکھائی دیتی تھی۔ قدرے تیز رفتاری سے جب وہ بازار میں سے گزرے تو پھٹ پھٹی کی آواز نے دکان داروں کی سماعتوں کو معمول سے زیادہ متاثر کیا۔ جب موٹر سائیکل دروازے پر پہنچا تو حیران ہوئے کہ دروازے پر تالا پڑا ہے۔ بچوں کے اصرار پر فریحہ شہر میں ہی آباد اپنے بھائی ثاقب کے گھر چلی گئی تھی۔ اور دروازے کی چابی ہمارے حوالے کر گئی تھی۔ وہ امی کو کہہ گئی تھی کہ آپ ابو کو پیار سے سمجھا دینا کہ میں صبح واپس آ جاؤں گی۔ پروفیسر صاحب کے ہاتھوں کی لرزاہٹ بڑھ گئی، کالا رنگ مزید کالا پڑ گیا۔ اور ان کی کمزوری اور ضعف میں اضافہ ہو گیا۔ جب سے بیمار ہوئے تھے آج پہلی مرتبہ ان کے گنگنانے کی آواز سنائی دی۔ رات گئے تک وہ بھدی آواز میں بڑبڑ کرتے رہے:

یہ زندگی کے میلے
دنیا میں کم نہ ہوں گے
افسوس ہم نہ ہوں گے

آدھی رات کے بعد ان کے گانوں کی آواز بند ہو گئی۔ شاید نیند نے ان کو اپنی چادر میں اوڑھ لیا۔ صبح وہ عموماً سات بجے اٹھ جایا کرتے تھے لیکن نو بجے تک مکمل خاموشی تھی۔ میں چھت پر چڑھ گیا۔ جنگلے سے لٹک کر ان کے گھر جھانکنے لگا۔ ان کی چارپائی صحن کے وسط میں شمالاً جنوباً بچھی ہوئی تھی لیکن وہ شرقاً غرباً چارپائی پر لیٹے تھے۔ دونوں ٹانگیں مشرق کی طرف نیچے لٹکی ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھ مضبوطی سے سینے پر بندھے تھے۔ جیسے خواتین نماز کے وقت حالت قیام میں باندھتی ہیں۔ میں نے آوازیں دیں "انکل ابو اٹھ جائیں۔ صبح ہو گئی ہے۔ ابھی فریحہ بھی آنے والی ہے۔" لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ تھوڑی دیر میں بات محلے والوں تک پہنچ گئی۔ کچھ

ہمسائے چھتوں پر سے ہوتے ہوئے ان کے صحن میں اترے۔ اور گلی والا دروازہ کھول دیا۔ محلے والوں کے اندازے کے مطابق ان کی موت آدھی رات کے بعد ہوئی تھی۔ بڑی کوشش کے بعد ان کے سینے پر بندھے ہاتھوں کو جدا کیا گیا۔ انکے ہاتھوں کے نیچے ایک رومال میں کچھ تصویریں تھیں۔ سب کی سب فریحہ کے بچپن کی۔ ایک تصویر میں وہ گھوڑا بنے ہوئے تھے تو ایک اور تصویر میں فریحہ ان کے کندھے پر سوار تھی۔ بسکٹوں کا لفافہ ان کے تکیے کے نیچے پڑا تھا۔ جن میں سے کچھ بسکٹ سر کے وزن کی وجہ سے ٹوٹ گئے تھے۔

مغرب کے بعد جنازہ تھا۔ سارے رشتہ دار، بیٹے بیٹیاں پہنچ گئے۔ فریحہ کی بیٹی کو صبح سے کھانسی لگی ہوئی تھی۔ اسلئے وہ جنازے سے کچھ دیر پہلے پہنچی۔ آتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پاپا جانی کے سرہانے ان کے کمزور کندھوں کو پکڑے بیٹھی رہی۔ جن پر وہ بچپن میں سواری کرتی تھی۔ اچانک اس کی نظر پاپا جانی کی دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت پر پڑی جو سفید لٹھے میں اور بھی سیاہ لگ رہی تھی۔ اس انگلی کو پکڑ کر فریحہ نے قدم قدم چلنا سیکھا تھا۔ اسی انگلی کو پکڑ کر وہ اپنے باپ کے ساتھ بسکٹ لینے جاتی اور چبوترے پر بیٹھ کر کھاتی۔ سوئم کے بعد سب لوگ گھروں کو جانا شروع ہوئے اور ہفتے بعد مکان کو تالا لگ گیا۔ مکان کے اندر اداسی اور خاموشی ایک دوسرے کو لپیٹ کر سو گئیں۔

ایک روز کرکٹ کی بال اٹھانے میں دیوار پھلانگ کر اس گھر میں اترا۔ بال کو ڈھونڈتے برآمدے میں چلا گیا۔ برآمدے میں ایک کونے میں پھٹ پھٹی گرد سے اٹی کھڑی تھی۔ اگلے ٹائر کے ساتھ کونے میں ایک لفافہ کھڑا نظر آیا۔ اس کو ہلانے پر اس میں سے موٹے آٹے جیسا سفوف نکل پڑا۔ یہ ذرات شاید ان سوجی والے بسکٹوں کے باقیات تھے جو میں نے اور پروفیسر صاحب نے ان کی وفات سے ایک رات پہلے خریدے تھے۔ لیکن شاید مہمانوں کو پسند نہ آئے اور بچوں نے انہیں ایک کونے میں پھینک دیا۔

دادی اماں نے نماز پڑھ لی ہے۔ اس منحوس پرندے کی چیخیں مسلسل سنائی دے رہی ہیں۔ دادی اماں نہ صرف پرندے کو بلکہ مرحوم کو بھی صلواتیں سنا رہی ہیں۔ میں چھت پر جاتا ہوں اور جنگلے کے اس پار جھانکتا ہوں۔ اچانک میری نظر کدو کی بیل پر پڑتی ہے۔ کدو کی بیل پر ایک بے موسم کا کدو اگا ہوا ہے۔ ایک بڑا سا پرندہ اس کو چونچیں مار رہا ہے۔ کوے کی طرح کالا، لمبی سرخ چونچ، سر پر کھچڑی کھچڑی کی سی کلغی اور کالے پاؤں۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنے پر پھڑ پھڑائے اور شام کے دھندلکے میں کہیں غائب ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

بے چاری

''ایڈیٹر صاحب!! کسی کامیاب و کامران مرد کے پیچھے ضرور کوئی عورت ہی ہوتی ہے جو اپنا کردار بخوبی نبھا کر مرد کو اعلیٰ اور شاندار کامیابی سے ہمکنار کر دیتی ہے؛ میں بھی اسی نوے فیصد مردوں کی طرح اس خوش کن عقیدے کا قائل ہوں مگر میں اس دعوے کا دوسرا حصہ زیادہ اہم اور ضروری سمجھتا ہوں کہ کسی مرد کی تباہی اور بربادی میں بھی بڑا ہاتھ کسی عورت ہی کا ہوتا ہے۔''

اس تحریر نے مجھے تھوڑا سا چونکا ضرور دیا تھا۔ فائل میں موجود بے شمار افسانوں میں یہ تقریباً آخری نمبروں میں موجود تھا۔ میرے مدیر اور معاون مدیر نے اسے درخور اعتنا نہ سمجھ کر فائل کے آخر میں کھسکا دیا تھا۔ دراصل آج ہی مجھے رسالے کو فائنل کرنا تھا اور اس کے لئے بس آخری افسانے کی تلاش تھی۔ فائل کے اوراق پلٹتے پلٹتے گھنٹہ بھر گزر چکا تھا مگر مجھے ابھی تک اپنے مطلب کی تحریر نہیں مل سکی تھی۔ یعنی تلاش ہنوز لاحاصل اور خواہش تشنہ تھی۔ معاونین بھی میرا مسئلہ حل کرنے میں سرخرو نہ ہو سکے تھے۔ خاص نمبر کے لئے عام موضوعات سے ذرا ہٹ کے تحریر تلاش کرنا میرا منشا تھا اور رسالے کی اشاعت کی گھڑی سر پہ آ گئی تھی۔ چار مناسب قسم کے افسانے میں پہلے ہی منتخب کر چکا تھا لیکن پانچواں اور آخری ہنوز زیر تلاش تھا۔ نگاہ انتخاب کسی تحریر پر ٹکتی ہی نہیں تھی۔ چند یار دوست اور مصنف حضرات بھی اپنی تحریریں شامل کرنے کے لئے مسلسل اصرار کر رہے تھے مگر میرا دل مان نہیں رہا تھا۔ سفارشی فون بھی آ رہے تھے۔ میں کسی طرح دباؤ کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر بھی ذہنی تناؤ بڑھ رہا تھا۔ سگریٹ پہ سگریٹ پھونک ڈالے؛ خوبرو سیکرٹری کو سامنے بٹھا کے خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگا، اس کی جھیل سی آنکھوں، ریشمی گیسوؤں اور مخروطی انگلیوں کا ذکر چھیڑا۔ سیکرٹری حیران ہو کر میرے چہرے کو تکنے لگیں مگر وہ میرے خشک مزاج سے واقف تھیں کہ ہو نہ ہو یہ ذہنی ٹینشن کو بھگانے کے حیلے ہیں پھر بھی اس کے سفید مرمریں چہرے پہ سرخی دوڑ گئی۔ مگر گتھی سلجھ نہیں رہی تھی اور آخر کار آخری تحریر کا انداز اور قصہ دونوں میری توجہ

نور کمال شاہ

حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے - میں نے اس کہانی کو فائل سے نکالا: اسسٹنٹ کو چائے لانے کا کہہ کر کسی کو بھی اندر بھیجنے سے منع کیا اور مسودہ پڑھنے لگا - عام سی تحریر تھی؛ خط کے انداز میں کہانی سی بیان کی گئی تھی - دیر تک میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ کوئی کہانی بیان ہوئی ہے یا ایڈیٹر کے نام خط تحریر کیا گیا ہے - کہانی کار میرے لئے بالکل اجنبی تھا - شائد کسی نئے افسانہ نگار نے لکھنے کی جسارت کی تھی یا کسی دکھیارے نے اپنا بھڑاس نکالنے کی ہمت دکھائی تھی - میں نے پوری توجہ سے تحریر آگے پڑھنی شروع کی------ --

"یہ قصہ شروع ہوتا ہے میری شادی سے، بلکہ یوں کہہ لیں کہ میرے بھائی کی شادی سے - مہینہ بھر کے اندر ماں جی اور دادی کی رحلت فرمانے سے ہمارا گلشن اجڑ کے رہ گیا - چمن کے مالی رخصت ہوئے تو پیچھے اجڑا ہوا خیر آباد سا ویرانہ ہی رہ گیا - گھر کی دیکھ بال تو چھوڑیں پیچھے کوئی کھانے پکانے والا بھی باقی نہ رہا - ہمارے دیہات میں ملازمہ کا تصور نہیں ہوتا بلکہ سارا کام کھانا پکانا؛ دھونا پونچھا اور صفائی ستھرائی گھر کے خواتین ہی کرتی ہیں - والد بزرگوار نے چند دن تک ٹیڑھی ترچھی روٹیاں توے پر ڈال کر ہمیں کھلائیں مگر یہ کام ان کے بس کا بھی نہیں تھا - گھر میں والد کے علاوہ ہم دو بھائی اور دو معصوم بہنیں رہ گئیں تھیں - بہنیں ہم بھائیوں سے چھوٹی تھیں - آٹھ دس سال کی بچیوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ گھر بار سنبھال لیں گی احمقانہ سی بات ہو گی - چنانچہ گھر کو ویران ہونے سے بچانے کے لئے والد صاحب نے میرے بڑے بھائی بھر پندرہ سولہ سال کی شادی کا فیصلہ کر لیا - والد صاحب چاہتے تو خود دوسری شادی رچا سکتے تھے مگر اولاد کو سوتیلی ماں کے اثر سے بچانے کے لئے انہوں نے اپنی قربانی پیش کر دی - بھائی کی پسند پر خالہ زاد رابعہ بیاہ کر ہمارے گھر پہنچ گئی - رابعہ ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی اور ہاسٹل میں زندگی گزار آئی تھی - اس کا موازنہ گھریلو لڑکیوں سے نہیں کیا جا سکتا تھا - چھ افراد پر مبنی مخصوص روایات سے جڑے بھرے پرے گھر کو سنبھالنا اس کے لئے ممکن نہ تھا - اگرچہ اس نے مقدور بھر کوشش کر ڈالی مگر اس سے نہ ہو سکا - مسئلہ حل نہ ہو سکا - کوشش کامیاب ثابت نہ ہو سکی؛ چنانچہ فقط دو سال کا عرصہ گزرنے کے بعد والد محترم نے میرے ذریعے معرکہ سر کرنے کی ٹھان لی - مجھے کم عمری میں والد کی خواہش کے آگے جھکنا پڑا اور شادی کے لئے ہاں کر دی - اس دفعہ میری مرضی نہیں پوچھی گئی بلکہ گاؤں ہی کی ایک لڑکی جو کام

کاج میں طاق بتائی جاتی تھی دلہن بنا کر میرے پلے باندھ دی گئی۔

میں نے جوانی کیسے گنوائی، پتہ ہی نہیں چلا۔ بسا اوقات تو گماں ہوتا تھا جیسے میرے زندگی میں شباب کا موسم کبھی آیا ہی نہیں۔ بچپن اور لڑکپن کے منازل کو پار کر کے میں سیدھا ہی بڑھاپے کے خانے میں داخل ہوگیا۔ اٹھارہ بیس سال کی عمر میں میری شادی کر دی گئی اور ساتھ ہی بچوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ دھونے دھلانے اور صفائی ستھرائی میں طاق جس بندی کو میرے پلے باندھ دیا گیا تھا وہ چٹی ان پڑھ اور گنوار تھی۔ ایسی بندی جب زمانے کی سرد گرم برداشت کیے بغیر کم عمری میں ماں بنے گی تو ذرا سوچیے وہ کیسی ماں ہوگی اور جس گھر کی وہ مالکن ہوگی، اس گھر کی کیسی حالت ہوگی---

بہرحال بچے سکول کی عمر کو پہنچ کر سکول جانے لگے اور دیگر کئی اہم اسباق کے ساتھ یہ سبق بھی ان کے ذہن میں بٹھا دیا گیا کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ جس قسم کا ماحول گھر میں پروان چڑھ رہا تھا اس سے تو قطعی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ بچے اس جنت کے حصول میں سنجیدہ ہیں۔ بے ادبی اور گستاخی کے برعکس میں اسے تربیت کا فقدان ہی کہوں گا۔ بچے انتہائی بے ترتیبی سے پلے بڑھے اور ادب و شائستگی کا مادہ ان میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوا۔ میں نے اپنے طور پر کچھ سدھار پیدا کرنے کی کوشش کی، انہیں ڈرایا دھمکایا، مار بھی پڑتی انہیں میرے ہاتھوں، مگر وہ سیانے کہتے ہیں نا: جو چیز خمیر میں گندھی ہو اسے بھلا کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔ دوم یہ کہ مرد اکثر گھر سے باہر رہا کرتے ہیں؛ اب میرے لیے گھر اور باہر دونوں کی ذمہ داریاں نبھانا ممکن نہ تھا، حالانکہ یہ ذمہ داری میرے کندھوں پر آن پڑی تھی۔ بہرحال بچے پلتے بڑھتے رہے۔ صورتحال یہ تھی کہ ایک بچہ لازمی طور پر دوسرے سے نالاں رہتا تھا؛ بڑے لڑکے کی اگر منجھلے سے نہیں بنتی تھی تو منجھلا چھوٹے کا دشمن تھا۔ بول چال اکثر بند ہی رہتی۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ ماں بھی اس ڈرامے کو خوب بڑھاوا دیتی۔ انہیں پاس لانے کے بجائے کوشش کرتی کہ ایک دوسرے سے الگ اور دور دور رہیں؛ کھانا الگ الگ کھائیں؛ جدا جدا سکول جائیں۔ میں دوریاں ختم کرنے کی کوشش کرتا، ایک کو سمجھاتا تو وہ دوسرے کی طرفداری کرنے بیٹھ جاتی۔ فرماتا تھا----

"بچے ہی تو ہیں، جب بڑے ہوں گے تو خود بخود سلجھ جائیں گے ---!!!"

ہر معاملے میں ان محترمہ کی مداخلت بلکہ انتہائی بے موقع اور بے جا مداخلت سارا

کھیل بگاڑ دیتی اور حالات سدھرنے کے بجائے مزید بگڑ جاتے۔
میں نہ تو خواتین کے خلاف ہوں اور نہ ہی ان کی اہمیت کا منکر۔ میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ تصویر کائنات میں رنگ خواتین کے دم قدم سے ہے۔ عورت کا وجود درمیان سے ہٹادیں تو دنیا کی دلکشی و رنگینی ساتھ ہی رخصت ہو جائے گی۔ میں نے ان محترمہ کو سمجھانے سے بھی کبھی پہلو تہی نہیں کی مگر وہ کسی طور سمجھنے والی نہیں تھی۔ شائد ان کا دماغ سرے سے تھا ہی نہیں یا الٹا ٹانکا گیا تھا کہ انہیں سیدھی بات سمجھ ہی نہ آتی۔ میں کبھی بچوں کو پڑھانے بٹھاتا، سختی کرتا تو وہ الٹے میری دشمن بن جاتے۔ نماز اور قرآن خوانی کے لئے بچوں کو سویرے جگاتا تو وہ ناک بھوں چڑھاتے،
"سونے بھی دے نا۔۔۔۔۔!!!
اتنے سویرے جگا کر کیا پیار کرانے کا ارادہ ہے۔۔۔۔۔؟؟"
ایک خوبی اگرچہ ان بچوں میں کمال کی تھی، سبق و پڑھائی میں بہت تیز تھے اور کلاس میں ہمیشہ اول ہی رہتے تھے۔ یہی شائد میرا کارنامہ تھا۔ اسی ایک ذمہ داری کو میں نے پوری طرح نبھایا تھا؛ بلکہ تعلیم کے سلسلے میں، میں نے خود کو مٹا کر ان کو جوڑ دینے کی کوشش کی تھی۔ ان کے اخراجات ہنسی خوشی برداشت کرتا، خود نہ پہنتا مگر ان کو اچھا پہناتا؛ خود نہ کھاتا اور ان کو خوب کھلاتا۔ دن رات ان کو کتاب کاپی سے جوڑے رکھتا؛ ضرورت سے زیادہ ان کو دیتا؛ پنسل، کاغذ، قلم، کتاب ہر چیز کا ڈھیر لگا دیا تھا میں نے ان کے لئے گھر میں۔ ہفتہ دو ہفتے بعد سکول جا کر ان کی تعلیمی حالت کا پتہ کرتا۔ اساتذہ سے رابطے میں رہتا۔ کوئی بھی کسر نہ اٹھا رکھتا اور شائد اسی کا کمال تھا کہ بچوں نے سکول میں خوب نام کمایا۔ وہ محترمہ ان تمام سرگرمیوں سے دور ہی رہتیں بلکہ شائد انہیں یہ امور پسند ہی نہیں تھے۔ بے تعلق اور پرسکون؛ ان کا شوق دھونا دھلانا، پکنا پکانا اور جھاڑو چلانے سے آگے نکلا ہی نہیں۔ الماری میں کتابیں تک رکھنے کا سلیقہ نہیں تھا ان میں۔ سمجھتی تو تھی نہیں کہ کون سی کتاب کہاں اور کیسے رکھنی ہے۔ ادھر ادھر پھینٹے رہنے کی وجہ سے اکثر قیمتی کتابوں کے صفحے نکل چکے تھے اور بیشتر پر تیل کی موٹی دھار جم چکی تھی۔ اس نیک بخت کو گھڑی میں وقت بتانا تک نہیں آتا تھا۔ پچاس تک گنتی نہیں کر سکتی تھی۔ ہزار روپے دے دیئے جاتے تو شام تک حساب نہ سمجھا پاتیں۔ سورج کو دیکھ کر وقت اور بجے کا تعین کیا کرتی تھی۔ یہاں پر میں انکشاف کرتا چلوں کہ تعلیمی سلسلہ مکمل کر کے میں ایک بڑے اور اہم سرکاری عہدے پر فائز ہو چکا

تھا- چنانچہ لوگ میرے عہدے کا لحاظ رکھتے ہوئے مناسب عزت اور احترام دیتے تھے- اسی احترام اور توجہ میں بچوں کو بھی ان کا حصہ مل جاتا تھا- انہیں اچھے سکولوں میں داخلے مل چکے تھے- اساتذہ اور پرنسپل ان کا خاص خیال رکھتے تھے- بچے ٹھیک ٹھاک جا رہے تھے؛ پریکٹیکل کے نمبر انہیں آسانی سے مل جاتے تھے-

بچے ماں سے زیادہ مجھ سے مانوس تھے اور مجھ ہی سے ڈرتے بھی تھے- میں موقع بہ موقع ان کو سیدھا بھی کر دیا کرتا تھا مگر اس نیک بخت کو کبھی بچوں کے لئے ایک بھی سخت لفظ منہ سے نکالتے نہیں دیکھا- میٹرک کے بعد بڑے لڑکے کو شہر کے اچھے کالج میں داخلہ دلوانا تھا؛ مجھے ہی دوڑ دھوپ کرنی پڑی، اور نہ صرف داخلہ دلوانا تھا بلکہ اخراجات کا بندوبست بھی کرنا تھا- ایک ہی تنخواہ میں ایسا کرنا مشکل تھا مگر جیسے تیسے کر کے میں نے انتظام کر ہی لیا-

سب سے چھوٹی بچی کو ماں کا دودھ چھڑوانا تھا، مجھے ہی کرنا پڑا- بچی دو سال کی ہو چکی تھی- ساری رات جاگ کر اور طرح طرح کے پھل مٹھائیاں وغیرہ پاس رکھ کر اسے اپنے ساتھ سلا دیتا؛ ماں کو اس کی نظروں سے دور کر دیتا- جب کبھی وہ بیدار ہو کر دودھ کیلئے مچلنے لگتی تو مختلف چیزیں کھلا کر اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کرتا- چار پانچ دن کی مسلسل محنت اور کوشش سے مقصد سر ہو چکا- بڑا لڑکا ماں کے ساتھ خالہ کے گھر گیا وہاں کسی درخت سے گر کر بازو تڑوا بیٹھا- مجھے اطلاع ہوئی تو بھاگم بھاگ پہنچا اور بچے کو ہسپتال پہنچا کر پلاسٹر چڑھوایا- بیماری تیماری میں بچے ماں کی ہاتھ سے دوائی نہیں لیتے تھے، بھاگنے لگتے تھے؛ مجھے ہی جا کر ان کو دوا پلانی پڑتی- اور اس پہ بھی یہ پکار سنائی دیتی کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے- ارے نیک بختو!! اگر جنت صرف ماں ہی کے قدموں تلے ہے تو باپ کے قدموں تلے کیا ہے؟ کیا فقط جوتے----!!!

بچے نے کوئی شرارت کی یا دوسرے لڑکوں سے لڑائی ہوئی مجھے ہی آ کر معاملات سنبھالنے ہوتے- گاؤں محلے میں خوشی غمی کے موقعے پر مجھے ہی جا کر حاضری دینی پڑتی؛ اس نیک بخت کو اتنی سمجھ اور توفیق کہاں! بعض اوقات میں سوچنے لگتا کہ ان کو انسانوں میں پیدا کر کے گویا بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے- ان کی کوئی عادت بھی انسانوں والی نہیں تھی- تہذیب و انسانیت کا سبق اس نیک بخت نے پڑھا ہی نہیں تھا- خدا جانے کس قسم کے لوگوں کے بیچ زندگی گزار آئی تھی- پھوہڑپن، بدمزاجی، تندخوئی، بداخلاقی، گستاخی و بے ادبی اس

کے مزاج و طبیعت کا مستقل اور نا قابل تغیر حصہ تھے- ہمارے گھر میں آتے ہی اس نے اعلیٰ اقدار کو چلتا کر دیا تھا- دعا سلام کا قاعدہ گھر سے رخصت ہو چکا تھا- انسانیت کی قدر اس نے اس قدر گھٹا دی تھی کہ اس گھر میں آ کر کوئی خود کو انسان یا اشرف المخلوقات سمجھ ہی نہیں پاتا تھا- اچھے برے کی تمیز، چھوٹے بڑے کا فرق مراتب، سب کچھ تباہ و برباد کر دیا تھا- ہمارے عزیزوں رشتہ داروں کی تو اس نے دو تین ہفتے کے اندر ہی ہمارے گھر سے چھٹی کرا دی تھی- اڑوس پڑوس والے غریب بھی قطع تعلق کر چکے تھے- جو بیچارے گھر والے تھے ان کی بھی زندگی اجیرن بنا دی تھی اس نے- والد محترم جو گھر کو بچانے کے فکر میں تھے اب اپنی اور اہل وعیال کی عزت بچانے کے لئے دعا گو تھے مگر پل کے نیچے سے پانی بہہ کر گزر بھی چکا تھا- ہم میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کریں تو کیا کریں- بیوی کو چھوڑنے کا تصور ہمارے ہاں نہایت ہی کریہہ اور برا سمجھا جاتا تھا- ان محترمہ کے لچھن اور عادات و اطوار دیکھ کر میرے تو پہلے ہی چودہ طبق روشن ہو چکے تھے- اتنا بدتہذیب و بداطوار انسان میرے تصور سے بھی بعید تھا- چھوٹوں کو برا بھلا کہنا، بڑوں کی انتہائی بے ادبی ان کا محبوب مشغلہ تھا- عزیز رشتہ دار پہلے ہی ہمیں چھوڑ چکے تھے- گاوں کے مکینوں اور اہل محلہ نے بھی ہمارے ہاں آنا جانا ختم کر دیا تھا- ان کی ہمارے گھر آنے سے ہمیں کسی بیرونی دشمن کی ضرورت نہیں رہی -ہم اس نیک بخت کے ہاتھوں بالکل الگ ہو کر رہ گئے تھے- ظاہر ہے جب آپ کسی کو خاطر میں نہیں لائیں گے تو دوسرے آپ کی کیا اور کیوں پرواہ کرنے لگے-------!!!

زندگی کے قدم وقت کی شاہراہ پر تیزی سے آگے بڑھتے رہے- والد محترم نے فانی دنیا سے رخت سفر باندھ لیا- بچے تعلیم حاصل کر کے بڑے آدمی بنے اور بیرون ملک جا کر مقیم ہوئے- کافی پیسے بھیجتے ہیں؛ دو تین سال بعد ملک کا چکر لگا کر ہمارا حال احوال پوچھ لیتے ہیں- یہ بدنصیب جوانی ہی میں ارتھرائٹس کا شکار ہو چکی تھی- جوڑوں کی بیماری نے رفتہ رفتہ اسے بے حال کرنا شروع کیا- میں نے اس کے دوا دارو میں کوئی کسر نہ چھوڑی- پانی کی طرح پیسہ بہایا میں نے اس کی علاج پہ مگر مرض کو قابو نہ کیا جا سکا- ہاتھ پیر اور مختلف جوڑوں میں شدید درد سے بات بہت آگے پہنچ چکی- ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں ٹیڑھی ہو چکی ہیں اور انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئی ہیں- کسی کام کے قابل نہیں رہی وہ اب- چارپائی کی

ہو کر رہ گئی ہیں۔ مشکل سے اسے اٹھاتے ہیں۔ مسلسل انجکشنوں نے اس کے بازو شل کر دیئے ہیں اور بغیر کسی سہارے کے اٹھنا اس کے بس کا نہیں رہا۔

اب میرا امتحان شروع ہو چکا۔ اسے آج میری بے حد ضرورت ہے۔ میں نے پہلے بھی اس کی خاطر اپنی ساری خوشیاں قربان کر دی تھیں۔ شادی کے بعد ایک دفعہ بھی مجھے ازدواجی زندگی کی اطمینان کا لمحہ نصیب نہ ہوا۔ میرے سامنے راستے کھلے تھے۔ میں کسی بھی راستے پہ نکل کے اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ سکتا تھا مگر میں ایسا نہ کر سکا؛ جانے کیوں؟ شاید مجھے اس سے عشق ہے مگر اس کا طرزِ عمل مجھے اس سے دور رکھے ہوئے ہے-----!!!

حد سے زیادہ خیال رکھتا ہوں اس کا: گھر سے میرا باہر نکلنا بند ہو چکا ہے۔ گھر میں اب ہم دونوں کے سوا ہے ہی کون---- ماضی کی تلخ یادیں اپنے ذہن سے زبردستی کھرچ چکا ہوں۔ کھانا بنا کے اسے کھلاتا ہوں؛ منہ ہاتھ دھلوا کر اسے صاف رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ روزانہ اسے کپڑے تبدیل کراتا ہوں؛ اس کی پسند کی چیزیں لا کر اسے کھلاتا ہوں۔ وقت پر دوائیں دیتا ہوں اور دو تین مہینے بعد ڈاکٹر کے پاس دکھانے بھی لے جاتا ہوں۔ حد درجہ کوشش کرتا ہوں کہ میری ذات سے اسے آرام ہی ملے۔ وہ شاید اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہی ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ کم از کم میری ذات سے اسے آرام ہی ملے۔"

فائل بند کر کے میں نے آرام کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور سوچوں میں ڈوب گیا۔ میں کسی منطقی فیصلے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ عورتوں کے حق میں تحریریں تو خوشدلی سے قبول کی جاتی ہیں؛ مصنف کو شاباش بھی مل جاتی ہے مگر مخالفت میں تحریر----

کیا ہمارا دانشور طبقہ اسے برداشت کر پائے گا----!!!

چند ساعتیں یوں ہی گزریں۔ گومگو کی کیفیت سے میں جلد ہی نکل آیا۔ اسسٹنٹ کو بلا کر تحریر کمپوز کروانے کے لئے اس کے حوالے کر دی۔ تکنیک کی کمزوریوں اور فنی اتار چڑھاؤ کے باوجود میں نے اسے پرچے میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جانے کیا سوچ کے ویسے ہی بلا مقصد فون اٹھا کر میں نے صاحبِ تحریر کا نمبر ملایا جو خط سے مجھے ملا تھا۔ تین چار گھنٹیاں بجنے کے بعد فون اٹھایا گیا۔ میں نے رسالے کے حوالے سے بطور ایڈیٹر اپنا تعارف کرایا تو پھیکی سی ہنسی کے بعد کہا گیا،

"چھوڑیں جی ایڈیٹر صاحب!!! قصہ ہی ختم ہو گیا اب تو----!!! مر گئی بیچاری؛ دفنا آیا ہوں اسے تین دن پہلے۔"

اور فون بند کر دیا گیا-------!!!!!

☆☆☆☆☆

چکر

میں نے ابھی جانا ہے بس ابھی، مجھے نہیں پتہ، آج مجھے امی سے ہر حال میں ملنا ہے بس، رات کو بہت ڈروانا خواب دیکھا تھا میں نے،، میں احمد سے اسرار کیے جارہی تھی-

یار سمجھو حالات کو اماں جان رات کو ہی آئی ہیں اتنا سفر کیا ہے انہوں نے ابھی ان سے کچھ بات بھی نہیں کی، کھانا کون بنائے گا، اور شام کو ڈاکٹر سے ٹائم لیا ہے، پھر پرسوں وہ واپس بھی چلی جائے گی ---احمد بڑی التجا میں کہہ رہے تھے-

نہیں مجھے ان کے ڈاکٹر کے کلینک میں گھنٹوں انتظار کرنا بڑا ہی اکتا دینے والا لگتا ہے پھر آدھ گھنٹہ وہ چیک اپ کرتا ہے پھر ان کی دوائیاں لو- نہیں بھئی اس مرتبہ مجھے معاف رکھو-- میرا امی کے گھر جانا آج اٹل ہے میں اپنا آخری فیصلہ دے چکی تھی-

صدف، صدف سنو یار، اماں تین چار ماہ کے بعد آئی ہیں ایک دو دن سے زائد رہتی نہیں، بیماری میں بھی کچھ نہیں مانگتی ایسے نہ کرو-

دیکھو، ڈبل روٹی اور کھچڑی اس کے علاوہ انہوں نے کھانا ہی کیا ہے،

تو کھچڑی امی کی طرف سے بنوا کے بھجوا دونگی، ڈبل روٹی تم لیتے آنا، بس اب جلدی کرو دیر ہو رہی ہے، میں اکتا چکی تھی- احمد ہار مانتے ہوئے اندر گئے اماں کو مطع کیا، موٹر سائیکل کی چابی لی میں نے بس سرسری سا سلام کیا اور نکل آئی، اماں پیچھے سے بس تکتی رہی خیر سے جاؤ بیٹا خوش رہو آباد رہو، باہر نکلتے ہی مجھے سکھ کا سانس آیا، اپنے کپڑوں کا تھیلا تھاما اور جلدی سے موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی-

کتنا سکون مل رہا تھا، شام کو اماں کے ڈاکٹر پہ ساتھ جانے کی ڈیوٹی سے بھی جان چھوٹی، اُف کتنا بکواس اور بورنگ کام، پھر دوائیں ڈھونڈو ان کا کھانا دو اور لمبی لمبی باتیں سنو، بس احمد جلدی سے چلو مجھے جلدی جانا ہے-

اچھا یار کیا کروں پر لگواں لوں، چل تو رہا ہوں ، رات سے آنکھوں میں سخت جلن ہے، دیکھو کتنی لال ہو رہی ہیں، لگتا ہے کہ بائیک چلاتے ہوئے آنکھوں میں کچھ پڑ گیا ہے، احمد نے آنکھیں ملتے ہوئے بیزار ہو کر بولے ، پتہ نہیں کیا منتر پڑتی ہیں اماں جی بیٹا کیا بھولا بنا پھرتا ہے، اماں جی اماں جی،، انکی تو بیماریاں ہی ختم نہیں ہوتی،، بلڈ پریشر، شوگر،

نوین روما

سرکا ورد، ہمارے مزے کے سارے دن شاید انہی سوچوں میں گزر جاتے ہیں -- ہر تین چار مہینے بعد وہ آجاتی ہیں دو دن تو پھر کہیں نہیں گئے اور ہائے اب کے تو نسرین کی شادی بھی ہے تب نہ ٹپک پڑیں۔ کھانا بنانا تو انکا خیر اتنا لمبا چوڑا نہیں ہوتا ہے - پتہ نہیں کیوں ان کے آنے سے مجھے اُلجھن سی ہوتی ہے صبح ہی آجاتی ہیں،، نیند خراب نہ صحیح طرح ٹی وی دیکھو اور میری لمبی فون کالز دو دن تک ڈسٹرب، ویسے اب تو وہ کافی عمر کی ہو چکی کچھ پتہ نہیں کب بلاوا آجائے، ان کی عمر کے تو سارے اس دنیا سے جا چکے ہیں اُف پتہ نہیں ان کو کب سکون ملے - ہائے کسی ایسے وقت نہ بستر پر پڑ جائیں جب امی کی طرف شادی ہو -- کوئی عید شب رات کو بری خبر نہ سنا جائیں، میرے دل میں تو وسوسے آنا شروع ہو گئے۔

امی کا گھر بالکل قریب آچکا تھا - - احمد پلیز مجھے کل نہیں بالکل پرسوں لینے آنا پلیز وہاں نہیں کہا سمجھا کرو۔

صدف حد ہو گئی احمد بالکل لاچار ہو گیا۔ اور کیا اسکو پہلے بتاتی تو مجھے لانا ہی نہیں تھا، کوئی نہیں ایسے ہی کرتا ہے اس نے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ میں دل ہی دل میں مسکرائی، خوش ہو گئی۔ امی کے گھر کی گلی کا ٹرن لیا تو سکون آیا گھر کو دور سے دیکھتے ہوئے مجھے لگا شاید کوئی باہر کھڑا ہے بھائی ہے ساتھ خالو جان، چاچا جی، خالہ بھی دکھائی دے رہی تھی - ارے یہ سارے گھر کے باہر کیوں آ رہے ہیں، بائیک گھر کے پاس جیسے ہی رکی میں چھلانگ لگا کر اُتری تقریباً بھاگی، گھر والوں کے پاس پہنچی، آپ لوگ باہر کیوں ہیں سب خیریت ہے نا میں نے گھبراتے ہوئے کہا، وہ امی، بھائی اتنا ہی بولا تھا۔ میں نے کچھ سنا نہیں اسے دھکیلتی ہوئی اندر گئی۔ اندر صحن کے وسط میں امی زمین پر پڑی تھی۔ میری بہن ان کے پاس بیٹھی تھیں امی کے ماتھے سے خون جاری تھا۔ میں نے دھاڑیں مارنی شروع کر دیں۔ امی امی کیا ہوا، امی کو فرش پر کیوں لٹایا ہے،، بولتی نہیں یہ خون کیوں نکل رہا ہے۔ میں نے چلانا شروع کر دیا۔

ہائے امی کو ڈاکٹر پہ لے جائیں، جلدی کرو، کس کا انتظار کر رہے ہو، کیوں دیر کر رہے ہو میری آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا رہا تھا۔ آنسو تھے کے بہتے ہی جا رہے تھے۔ احمد احمد، کہاں رہ گئے آپ کوئی گاڑی لاؤ کوئی ایمبولینس منگواؤ---

سفینہ روتے ہوئے بتانے لگی کہ،، امی سیڑھیاں نیچے اتر رہی تھی پیر پھسل گیا نیچے گر گئی ہیں سر پھٹ گیا ہے، چھوٹی بہن بولے جا رہی تھی اور میں یکدم پتھر کی بنی کھڑی تھی احمد سامنے کھڑے تھے ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے لیکن سُرخ آنکھوں میں ٹھنڈک تھی--

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے نلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو، سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

رات میں نے سرکٹ ہاؤس میں گزاری ACG ظفر اقبال نے میرے لئے وزیر اعلیٰ کے لئے مختص سویٹ کھلوا دیا۔ سرکٹ ہاؤس گلزار صادق کے بالمقابل ہے۔ نواب بہاولپور نے اسے تعمیر کرایا تھا جس کی وقتاً فوقتاً توسیع و تزئین ہوتی رہی ہے۔ صبح جب سیر کے لئے گلزار صادق گیا تو قدرے مایوسی ہوئی۔ نواب بہاولپور نے شہر میں کئی محلات بنوائے ہیں۔ ان کے مقابلے میں یہ اُجڑا اُجڑا اور ویران سا لگتا تھا۔ اس کی وجہ بعد میں معلوم ہوئی۔ ایک طویل عرصہ تک کارپوریشن اور کنٹونمنٹ میں اس کی ملکیت

کے متعلق مقدمہ بازی چلتی رہی۔ معاملہ سپریم کورٹ تک جا پہنچا۔ دو ملاؤں میں اگر مرغی حرام ہوتی ہے تو پھر دو مہاشوں میں ایک باغ کیونکر سرسبز و شاداب رہ سکتا تھا۔

ناشتے کے بعد ایک پرائیویٹ گاڑی میں رحیم یار خان پہنچا۔ جب دفتر پہنچا تو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ ڈی سی صاحب وہاں موجود نہ تھے۔ عملہ بھی مجھے نہ پہچان سکا۔ غالباً وہ انہیں میری آمد کے متعلق بتانا بھول گئے تھے۔ چارج رپورٹ بھی تیار نہ تھی۔ میں خاموشی سے کینال ریسٹ ہاؤس آ گیا۔ وہاں پہنچ کر ڈپٹی کمشنر ہاؤس فون کیا تو آپریٹر نے بتایا کہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک بجے کے قریب لان میں کھٹ پٹ شروع ہوئی تو پتہ چلا کہ ڈسٹرکٹ کونسل کے چیئرمین رفیق حیدر لغاری نے ان کے اعزاز میں کھانا کیا ہوا ہے اور یہ تیاری اسی سلسلے میں کی گئی ہے۔ رفیق حیدر لغاری سے میری پرانی شناسائی تھی۔ جب وزارت علیہ کی دوڑ شروع ہوئی تو لغاری صاحب بھی بطور Dark horse اس میں شامل تھے۔ جنرل جیلانی نے اصل اُمیدوار کو کیموفلاج کرنے کے لئے کئی سیاست دانوں کو ''تھاپڑا'' مارا تھا۔ لغاری صاحب کی تگ و دو صرف فونوں تک محدود تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر چیف منسٹری جرنیل نے دینی ہے تو پھر وقت اور پیسے کے ضیاع کا کیا فائدہ ہے۔ ہم اکثر ان کے گھر جاتے اور وہاں بیٹھ کر حسین خوابوں کے تانے بانے بنتے۔

لغاری صاحب کو پتہ چلا کہ میں ریسٹ ہاؤس میں موجود ہوں تو دوڑے دوڑے چلے آئے اور اُلٹا گلہ کیا کہ میں نے اپنی آمد کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ اب میں انہیں کیا بتاتا۔ باتوں باتوں میں انہوں نے اشارتاً اتنا بتایا کہ ڈی سی سیٹھ اسلم کے ذریعے تبادلہ رکوانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سیٹھ اسلم سے ان کا کیا رشتہ ہے؟ میں نے پوچھا۔ اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

کھانے پر مارتھ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس سے پہلے میں انہیں کبھی نہیں ملا تھا۔ ملاقات پر تو انہوں نے کسی قسم کی معذرت کی اور نہ میں نے گلہ شکوہ کیا۔ البتہ کھانے کے بعد میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے ''کیا آپ چند دن مزید انتظار کر سکتے ہیں؟ میرے کھانے ہو رہے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ ان میں 'سابقہ ڈپٹی کمشنر' کی حیثیت سے شرکت کروں۔'' غالباً پندار مناصب کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ میں اس کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

Take your time

ویسے ایوب مارتھ صاحب دھیمے مزاج کے کم گو انسان تھے۔ یہ درست ہے کہ جٹ جتنا

بھی پڑھ جائے اس میں سے چند چیزیں نہیں جاتیں جن میں ایک ضد بھی ہے۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ ان کی میاں عبدالخالق سے مخاصمت کیونکر بڑھی۔ اس میں یقیناً خالق کا ہاتھ بھی ہو گا۔ بعض اوقات ڈر پیشگی پیش بندی کراتا ہے۔ ویسے تو پنجاب میں برادری ازم زوروں پر ہے اور ہر ذات کا آدمی اپنے لوگوں کی تھوڑی بہت مدد کرتا ہے لیکن یہ دو قومیں اکثر ایک دوسرے کے دست و گریباں رہتی ہیں۔

مجھے لاہور سے ضیاء الحق کے برادر نسبتی ڈاکٹر بشارت الٰہی کا فون آیا کہ خالق کا خیال رکھنا، پہلے ڈی سی نے اس کا خاصا ٹیٹوا دبایا ہے۔ جب مجھے ملنے آیا تو پھٹ پڑا۔ کہنے لگا "مارتھ نے مجھے مار کر رکھ دیا ہے۔ میرے خلاف پانچ جھوٹے مقدمات بنوائے ہیں جن میں ایک زنا کا بھی ہے۔"

مارتھ صاحب کو جلد احساس ہو گیا کہ سیٹھ اسلم نے جس کام کا بیڑہ اٹھایا ہے وہ اس کے بس کا روگ نہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ رحیم یار خان کا امیر ترین آدمی تھا لیکن درحقیقت ایک تھانیدار یا مجسٹریٹ کے دبکے کی مار بھی نہ تھا۔ Self-made آدمی تھا۔ تقسیم سے قبل ہندو تھا۔ جب بٹوارا ہوا تو لالہ جی نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ ہجرت کی صورت میں ساری کمائی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ چنانچہ اس نے مولوی بلایا اور فوراً اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ اگر کہیں سے مخالفت میں کوئی آواز اٹھی بھی تو اس نے اسے سیم و زر تلے دبا دیا۔ بنیادی طور پر وہ بڑا زیرک، چالاک اور چاپلوس انسان تھا۔ اس کے کان میں کہیں بھنک پڑ گئی کہ میں اس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ پہلی ملاقات پر ہی اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ کہنے لگا صاحب افسروں کے تبادلے تو ہوتے رہتے ہیں، ہمیں کسی سے کیا لینا دینا۔ افسر تو مائی باپ ہوتے ہیں۔ شاید میرے کسی مخالف نے آپ کے کان بھرے ہوں۔ قسم لے لیں اگر میں نے لیاقت پور بھی کراس کیا ہو۔ لاہور تو بہت دور ہے۔ مروت میں میں اس سے یہ نہ پوچھ سکا کہ کون سی سوگند چلے گی۔ سابقہ یا حاضرہ!

چارج لینے کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ویسے تو ڈپٹی کمشنر کو ہر کسی سے ملنا پڑتا ہے لیکن جو Vocal groups ہیں ان میں بار، پریس، علمائے کرام، سیاست دان اور تاجر برادری ہے۔ رحیم یار خان میں پہلی ملاقات بوجوہ مولوی صاحبان سے کرنا پڑی۔ چودہ سو سال میں ان کی اہمیت کم نہیں ہوئی، کچھ بڑھی ہی ہے۔ جمعہ کے خطبات کی صورت میں ان کے پاس جو موثر ہتھیار ہے وہ انتظامیہ کو تقویت بھی پہنچا سکتا ہے اور مفلوج کر کے بھی رکھ دیتا ہے۔ عام آدمی

بنیادی طور پر اسلامی ذہن رکھتا ہے۔ وہ لوگ جو بظاہر لبرل ہیں وہ بھی مولوی کے وعظ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ عام زندگی میں مولویوں کے ساتھ تعلق یا رشتہ داری سے شاید گریزاں ہوں لیکن نماز سے پہلے یا بعد میں جو کچھ بھی وہ کہتا ہے اس کو نہ صرف ذہنی طور پر قبول کرتے ہیں بلکہ حرز جاں بھی بنا لیتے ہیں۔ دراصل ایک عجیب قسم کا Paradox ہمارے اندر موجود ہے۔ اس کی مثال میں نے اپنی کتاب ''اجنبی اپنے دیس میں'' دی ہے۔ بلوچستان میں جتنی کوئلے کی کانیں ہیں وہاں سوات، بنّوں، ہنگو اور کوہاٹ سے آئی ہوئی لیبر کام کرتی ہے۔ کان کنی اتنا مشکل کام ہے کہ مقامی لوگ وہ کام نہیں کر سکتے۔ کچھ ہزارے ضرور مزدوری کرتے ہیں لیکن اُن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ یہ لوگ اپنی ہفتے کی کمائی ایک شب میں کوئٹہ کے بازار حسن میں لٹا دیتے تھے۔ وہاں ایک مرتبہ امام مسجد اور دلالوں میں جھگڑا ہو گیا۔ جب پٹھانوں کو پتہ چلا کہ امام مسجد کو زدوکوب کیا گیا ہے تو وہ چاقو چھریاں اور فولادی مکے لے کر پہاڑ پر سے نیچے اُتر آئے اور کوئٹہ پہنچ کر دلالوں اور طوائفوں کو مار مار کر لہولہان کر دیا۔ ''خوچہ امارے امام کو مارا ہے'' یہ بات ان کی برداشت سے باہر تھی۔ اب اس واضح تضاد کو آپ کیا نام دیں گے۔ ادھر جنسی بے راہ روی کا یہ عالم کہ کوئٹہ کا چکلہ ان کے دم قدم سے آباد ہے۔ اور ادھر مذہبی جنون اس قدر کہ امام مسجد کو لگتا ہوا ایک تھپڑ برداشت نہیں کر سکتے۔

رحیم یار خان میں جتنے ترش مزاج مولوی تھے ان کی اکثریت باہر سے آئی تھی۔ مولوی غلام ربانی حضرو کا رہنے والا تھا۔ حافظ اکبر کا تعلق چکڑالہ ضلع اٹک سے تھا۔ قاری حماد اللہ شفیق مظفر گڑھ کا رہائشی تھا۔ یہ بڑے منظم تھے۔ ضیاء الحق نے مدرسوں کی امداد کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس نے ان کی قوت میں مزید اضافہ کر دیا۔ مدرسوں میں داخل طلب علم ان کی ایک طرح سے فوج تھے۔ جب اور جہاں چاہتے ہڑتال کرا دیتے۔ ہر محکمہ ان سے ڈرتا تھا۔ انتظامیہ اور پولیس بھی کنی کتراتی۔ علاقے کے خطرناک مجرم بھی ان کو سلام کرنے آتے۔ انہوں نے مدرسوں کی صورت میں مساجد سے ملحق بہت بڑی عمارتیں کھڑی کر رکھی تھیں۔ حکومت سے امداد کے علاوہ سارا شہر انہیں چندہ دیتا۔ ایک دفعہ حافظ اکبر نے جمعہ کے وعظ میں مقامی تھانیدار کے خلاف پورا ''قصیدہ'' پڑھ ڈالا۔ اسے ان سب FIR's کے نمبر تک یاد تھے جن میں ایس ایچ او نے رشوت لی تھی۔ شام کو تھانیدار حافظ صاحب کی

خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس نے اپنی سابقہ کوتاہیوں کی معافی مانگی اور آئندہ کے لئے مالی معاونت کا وعدہ کیا۔ حافظ صاحب فراخ دل انسان تھے، اسے معاف کر دیا اور اگلے جمعے وعظ کے دوران فرمایا "میں نے تفتیش کی ہے۔ یہ تھانیدار بے گناہ ہے۔ لہٰذا سب الزامات واپس لئے جاتے ہیں۔"

ایک دفعہ ڈپٹی کمشنر ایوب مارتھ اور ایس ایس پی انعام الرحمٰن سحری نے ایک قادیانی وکیل پرویز باجوہ کے گھر جا کر کھانا کھا لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ سارے شہر میں ان کے خلاف جلسے جلوس نکلنے شروع ہو گئے۔ بالآخر ڈی سی کو مولانا ربانی کی مسجد میں جا کر باقاعدہ معافی مانگنی پڑی۔ ان کے پاس ہر آنے والے افسر کا شجرہ ہوتا۔ سونگھ سونگھ کر اس کی کیمسٹری معلوم کرتے۔ اس کا مسلک کیا ہے؟ کچھ لیتا دیتا ہے یا نہیں؟ موج میلے کا شوقین ہے یا خشک مزاج ہے؟ ڈرپوک ہے یا جی دار! اس کی منجملہ کمزوریاں کیا ہیں اور انہیں کس طرح Exploit کیا جا سکتا ہے۔ پہلی ملاقات میں ہی مولانا ربانی نے پوچھ لیا "آپ کا مسلک کیا ہے۔ سنی ہیں یا شیعہ؟ اگر سنی ہیں تو دیوبند مکتبہ فکر سے تعلق ہے یا بریلوی حضرات کے قریب ہیں۔ مقلد ہیں یا غیر مقلد، اس کے علاوہ بھی مولانا صاحب نے چند سوالات کیے جن کے معانی اور مفاہیم سے میں یکسر نا آشنا تھا۔ میں نے کہا "مولانا صاحب! میں سیدھا سادا مسلمان ہوں۔ مسالک کی کٹھناؤں میں چلنے کا عادی نہیں ہوں۔ میری کوئی ذاتی پسند یا ناپسند نہیں ہے۔ میرے نزدیک بہتر انسان وہ ہے جو خلق خدا میں فساد نہیں کراتا بلکہ پیار، محبت اور یگانگت کے رشتے قائم کرتا ہے۔ میں علمائے کرام کی دل سے عزت کرتا ہوں کیونکہ اپنی تمام تر کمزوریوں اور تعصبات کے باوجود یہی لوگ ہیں جنہوں نے دین کا پرچم تھام رکھا ہے اور مساجد آباد ہیں۔"

میرے ان کلمات سے دیگر علمائے کرام تو خاصے متاثر نظر آئے لیکن مولانا ربانی اور ان کے فرزند ارجمند رؤف ربانی مطمئن نہ ہوئے۔ کیونکہ ان کا سوال ہنوز تشنہ جواب تھا۔ رؤف ربانی نوجوان تھا۔ انگلینڈ میں بھرپور زندگی گزار کے والد صاحب کی گدی سنبھالنے تازہ تازہ رحیم یار خان میں وارد ہوا تھا۔ مولانا ربانی ایک تو عمر کے آخری حصے میں تھے پھر مسلسل بیمار رہتے۔ یہی وجہ تھی کہ رؤف کو لندن کی مصروفیات چھوڑ کر اچانک واپس آنا پڑا۔

حافظ اکبر خاصا اکھڑ مزاج تھا۔ چکڑالے کے سبھی لوگ تیز طبیعت کے ہوتے ہیں۔ چکڑالہ تحصیل تلہ گنگ کا علاقہ ہے۔ پتھریلی پہاڑی اور بنجر زمینوں کا مزاجوں پر بھی اثر

ہوتا ہے۔ پھر مذہب کا تڑکہ لگا ہو تو دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ میرا "گرائیں" تھا اس بنا پر میرے لئے اپنے اصولوں پر سمجھوتہ کیے بغیر نرم گوشہ رکھتا تھا۔ قاری حماد اللہ شفیق بڑا کائیاں تھا۔ بھاری بھرکم وجود اور آبنوسی رنگ کے اس مولوی کو پتہ تھا کہ لوہا کب گرم ہوتا ہے اور ضرب کس قدر شدید لگانی ہے۔

شیعوں کا لیڈر محمد حسن زیدی تھا، یہ چونکہ وکیل بھی تھا اس لئے انتظامیہ سے تعاون اس کی مجبوری تھی۔ اہل زبان تھا۔ خاصا تیز طرار لیکن اپنے "ہنر کے معجزے" اس لئے نہ دکھلا سکتا تھا کیونکہ شیعہ اقلیت میں تھے اور دبے دبے سے رہتے تھے۔ اس لئے زیدی صاحب اپنے بیان اور چرب زبانی میں وسعت پیدا نہ کر سکتے تھے۔ بریلوی حضرات اکثریت میں تھے لیکن سواد اعظم میں کوئی اس پائے کا متحرک لیڈر نہ تھا۔ مولوی ترین صاحب صلح کل انسان تھے۔ انتظامیہ سے بھی ان کا میل جول کم تھا۔ خانپور میں مولانا عبداللہ درخواستی کا بہت بڑا علمی گھرانا تھا۔ مولانا صاحب کے متعلق مشہور تھا کہ انہیں ایک لاکھ احادیث ازبر تھیں۔ ان کے بیٹے بالخصوص مولانا مطیع الرحمٰن گو مسلک کے معاملے میں متشدد اور راسخ العقیدہ تھے لیکن انتظامیہ سے بہر حال تعاون کرتے تھے۔ طبعاً بھی بڑے حلیم تھے۔

مولانا خیر محمد مکی کا تعلق لیاقت پور کی تحصیل شکل حمزہ سے تھا۔ لسان العصر مولانا مکی صاحب کی علمیت کے متعلق دو آرا نہیں ہو سکتیں۔ نہایت حلیم الطبع اور فہم و فراست کا پیکر تھے۔ مولانا حرم شریف میں مستقلاً درس دیتے تھے۔ اس لئے رحیم یار خان کبھی کبھار آتے۔ میں نے ان کی علمیت سے بھرپور استفادہ کیا۔

دوسری اہم ملاقات ڈسٹرکٹ بار سے تھی۔ اس وقت بار کے صدر اشرف کینیڈی تھے۔ ایک طویل عرصے سے یہ روایت چلی آتی ہے کہ جب بھی کوئی ڈپٹی کمشنر ضلع میں جاتا وہ اپنی اوّلین فرصت میں ضلع کی بار کو ضرور خطاب کرتا ہے۔ کیونکہ بلحاظ عہدہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی ہوتا ہے اور جوڈیشل آفیسر بھی۔ بار اور بنچ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر چند کہ یہ اصطلاح اب خاصی گھسٹ پٹ گئی ہے کہ بار اور بنچ ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں لیکن یہ حقیقت اب بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ جوڈیشری کی گاڑی ان پہیوں کے بغیر چل نہیں سکتی۔ ویسے بھی ان کا احترام ضروری ہے۔ بارز کا تعلق چاہے ملک کے کسی حصے سے بھی ہو Cream of Intelligentia ہوتی ہیں۔ قانون، ادب، ثقافت اور اعلیٰ انسانی اقدار کے چشمے انہیں اداروں سے پھوٹتے ہیں۔ تحریک پاکستان سے لے کر قیام پاکستان تک اور قیام پاکستان سے استحکام پاکستان تک وکلا نے جو اجتماعی اور انفرادی جدوجہد کی ہے وہ

ہماری قومی تاریخ کا ایک زریں باب ہے لیکن جو چیز انہیں دیگر اداروں سے منفرد اور ممتاز کرتی ہے وہ جمہوریت کی جنگ ہے۔ جب بھی اس ملک میں آمریت کی آندھیاں چلیں جب بھی شخصی آزادیوں کو سلب اور پامال کیا گیا، جب بھی زبان و بیان پر پہرے بٹھائے گئے جب بھی کسی ڈکٹیٹر نے اقتدار کے نشے میں 'مل من مبارز' کا رجز کیا تو وکلاء ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح اس کے سامنے ڈٹ گئے اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ قید و بند کی صعوبتیں 'نارواسختیاں' ان گنت مشکلات، کوئی چیز بھی ان کے پائے استقامت کو متزلزل نہ کر سکی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کالا کوٹ پہن کر آدمی فرشتہ بن جاتا ہے۔ ہر پیشے کی طرح ان میں بھی کالی بھیڑیں ہیں۔ غالباً ان کی سب سے بڑی کمزوری جو ایک اعتبار سے قوت بھی ہے، یہ ہے کہ کسی وکیل کے جوڈیشل افسر سے اختلاف کی صورت میں یہ یکجا اور یک زبان ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں یہ نہیں دیکھتے کہ حق پر کون تھا اور زیادتی کس کی تھی۔ جب بھی کسی جوڈیشل افسر اور وکیل کا جھگڑا ہوا ہے بالآخر بستر افسر کا ہی گول ہوا ہے۔ یو کرامت کا قصہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ ادیبوں اور شعرا نے ان پر بڑی پھبتیاں کسی ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے لکھا تھا:

پیدا ہوئے وکیل تو شیطان نے کہا
لو آج ہم بھی صاحب اولاد ہو گئے

.....

اکبر صاحب غالباً یہ بھول گئے تھے کہ شیطان کو نکیل بھی یہی لوگ ڈالتے ہیں۔ دوسری دلچسپ نظم راجہ مہدی علی خان کی ہے ایک ماڈرن لڑکی حیلوں بہانوں سے تصویر دیکھ کر ہر رشتہ ٹھکرا دیتی ہے۔ اس کے لئے ایک وکیل کا رشتہ آتا ہے تو وہ کہتی ہے:

یہ ایل ایل بی ہے پر اللہ بچائے ان وکیلوں سے
یہ ہر اک بات منوا لے گا قانونی دلیلوں سے
یہ ڈائی ووِرس، بائی فورس دے سکتا ہے حیلوں سے
میرا گھر لوٹ لے گیا قرقیوں سے اور اپیلوں سے
نہیں امی! نہیں امی!

.....

دراصل وکلا اور جوڈیشل افسر کے درمیان اختلاف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب افسر دُہرا معیار اپناتا ہے۔ کچھ لوگوں کی ضمانتیں منظور ہو جاتی ہیں اور دیگر محروم رہ جاتے ہیں یا سول جج منظور نظر لوگوں کو Relief دے دیتے ہیں جبکہ دوسروں کے معاملے میں ہر قانونی ضابطہ انہیں یاد آ جاتا ہے۔ میرا بیالیس سال کی سروس میں کبھی بار سے اختلاف نہیں ہوا۔ انفرادی طور پر ایک دو مرتبہ نوک جھونک ضرور ہوئی ہے۔ اس سے

بھی اہم بات یہ ہے کہ آپ وکلاء کی عزت نفس کا ضرور خیال کریں۔ غصے سے فائلوں کو میز پر پٹختا یا وکیل کی پوری بات نہ سننے سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ہر کام ہو بھی نہیں سکتا۔ بس ذرا تحمل سے بحث سنیں اور اگر ہو سکے تو تھوڑی سی مسکراہٹ بھی لبوں پر وقتاً فوقتاً بکھیریں۔ کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ ہم سب انسان ہیں روبوٹ نہیں۔ صدر بار نے کچھ مطالبات پیش کیے ضلع کچہری میں سرکاری زمین پر چیمبرز کی تعمیر، بار روم لائبریری کے لئے گرانٹ، وکلاء کے لئے کالونی کا قیام۔ آڈیٹوریم کی تعمیر۔ میں نے اپنے قیام کے دوران جو اتفاق سے خاصا طویل تھا، ان کے بیشتر مطالبات پورے کیے۔

پریس کلب: پریس کلب جانا اور صحافیوں سے ملاقات بھی ڈپٹی کمشنر کے اولین فرائض میں شامل ہے۔ اس دور میں صحافت نے جو اہمیت اختیار کر لی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اسے حکومت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ بالفرض نہ بھی ہو تو باقی تین ستونوں کو بڑی سہولت کے ساتھ متزلزل کر سکتا ہے۔ اس وقت پریس کلب کے صدر بشیر امانت علی تھے جو نہایت شریف انسان تھے اور زرد صحافت کے بہت خلاف تھے۔ یہ درست ہے کہ بعض صحافی ضابطہ اخلاق کا خیال نہیں رکھتے اور ذاتی منفعت کے لئے بلیک میلنگ پر اتر آتے ہیں لیکن ایسے لوگ زیادہ دیر تک کاٹھ کی ہنڈیا چولہے پر نہیں چڑھا سکتے۔ ان کی نگاہ امیر آدمیوں کی جیبوں پر ہوتی ہے اور یہ انہیں بلیک میل کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ایک مقامی صحافی نے سیٹھ اسلم کو بلیک میل کر کے لاکھوں روپے بٹورے۔ ایک دفعہ سیٹھ اسلم نے ہاتھ روکا تو اس نے مقامی اخبار میں اس کی کردار کشی کرتے ہوئے عجیب وغریب خبریں لگانی شروع کر دیں۔ آج سیٹھ اسلم نے بغیر وضو کے نماز پڑھی ہے۔ وہ دراصل یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ذہنی طور پر یا درپردہ وہ آج بھی ہندو ہے۔ خود ہی کوکا کولا کی بوتل میں مکھی ڈال کر تصویر چھاپ دی۔ ایک دن سیٹھ میرے پاس آیا اور رونے لگا۔ میں نے اس صحافی کو سمجھا کر اسلم کو اس عذاب سے نجات دلائی۔ ایک دفعہ دو جونیئر فوجی افسر چولستان میں ہرن کا شکار کھیلتے ہوئے پکڑے گئے۔ مقامی پریس نے وہ خبر جلی حروف میں لگا دی۔ دوسرے دن کرنل مکمل میرے پاس آئے اور کہنے لگے "آپ کے صحافیوں نے ہماری بڑی بے عزتی کی ہے۔ آپ ان کے خلاف ایکشن لیں۔" میں نے انہیں سمجھایا کہ پریس آزاد ہے اور ڈپٹی کمشنر کا صحافیوں پر

کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ ان کی منت کی جا سکتی ہے لیکن اب فائدہ کیا ہے جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے۔ وہ یہ بات سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں عمداً صحافیوں کے خلاف ایکشن نہیں لے رہا۔ کچھ عرصے بعد میرے دیرینہ واقف بریگیڈیئر منصور حامد مجھے ملنے آئے۔ کہنے لگے کیا بات ہے تم نے مقامی فوج کو ناراض کر ڈالا ہے۔ وہ کہتے ہیں ڈی سی پریس کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے۔ وجہ پوچھی تو بتانے لگے کہ افسروں کے خیال میں تم انہیں Protect کر رہے ہو میں نے انہیں ساری بات سمجھائی تو مغائرت کی برف پگھلی۔ جب ہم زرد صحافت کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں چند معاشی حقیقتوں کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ اگر مالی اعتبار سے ہمارے صحافی کا مغربی جرنلسٹ سے تقابل کیا جائے تو درمیان میں ایک دیوار گریہ کھڑی نظر آتی ہے۔ کچھ ایسے اخبارات بھی ہیں جو اپنے نمائندوں کو کچھ دیتے نہیں بلکہ لیتے ہیں یعنی خود کماؤ۔ آپ بھی کھاؤ اور ہماری بھی تھوڑی بہت ٹہل سیوا کرو۔ ان حالات میں وہ سیٹھ اسلم کی ٹانگ نہیں کھینچے گا تو کیا کرے گا؟

گورحیم یار خان کا شہر اتنا بڑا تو نہیں لیکن خاصا صاف ستھرا اور سرسبز و شاداب ہے۔ سڑکیں کشادہ ہیں، بازار بارونق ہیں - ریلوے اسٹیشن سے نکلیں تو بازار شروع ہو جاتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر ہاؤس بھی چار پانچ ایکڑ کے رقبے پر محیط ہے۔ انگریز کے وقت جو لوازمات تھے وہ کافی حد تک اب بھی چلے آ رہے ہیں۔ سرسبز و شاداب لان جن میں روز گارڈن ہوتا ہے۔ مسلح گارڈز کے لئے دفتر اور رہائشی کمرہ، ٹیلی فون آپریٹر کے دفتر، تین آپریٹر باری باری چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دیتے ہیں کیونکہ رات گئے تک لاہور سے سرکاری کالیں چلتی رہتی ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب وزیراعلیٰ یا چیف سیکرٹری سے بات نہ ہوتی ہو۔ وزیراعلیٰ اپنے ممبران کی حرکات و سکنات پر کڑی نگاہ رکھتا ہے تو چیف سیکرٹری کو لاء اینڈ آرڈر کی فکر ہوتی ہے۔ آؤٹ ہاؤسز بھی اسی چار دیواری کے اندر ہوتے ہیں۔ جن میں ڈرائیور باورچی، مالی، دھوبی اور گائے بھینس کے رکھوالے رہتے ہیں۔ گویا ایک کمپاؤنڈ میں ڈی سی کے علاوہ بیس پچیس لوگ رہتے ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں پنکھا، قلی، مالشیے، کتوں کو نہلانے والے حقہ گرم کرنے والے بھی ہوتے تھے۔ اب ان کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

ڈپٹی کمشنر ہاؤس کے بالمقابل رحیم یار خان کلب ہے۔ بلحاظ عہدہ ڈی سی اس کا صدر ہوتا ہے۔ گھر اور ضلع کچہری کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں۔ صرف محکمہ نہر کی کالونی

ہے۔ کالونی کے آخری سرے پر دو ریسٹ ہاؤسز ہیں۔ کینال ریسٹ ہاؤس اور ہائی وے ریسٹ ہاؤس۔ یہ ہیں تو دیگر محکموں کی ملکیت لیکن ان کا انتظامی کنٹرول ڈپٹی کمشنر کے پاس ہوتا ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کس مہمان نے کب اور کتنے دن ٹھہرنا ہے۔

ضلع کچہری کے جنوب میں میونسپل کارپوریشن اور ضلع کونسل کے دفاتر ہیں۔ لیور برادرز کا کارخانہ بھی عملاً شہر کے اندر آ گیا ہے۔ صادق کینال برانچ عملاً دو حصوں میں تقسیم ہو کر شہر کے اندر اور باہر سے گزرتی ہے۔ اگر غیر ضروری رش نہ ہو تو آدمی بیس منٹ میں گاڑی میں بیٹھ کر سارے شہر کی سیر کر سکتا ہے۔ ضلعے کے رؤسا کی لاہور، اسلام آباد اور مری میں تو کوٹھیاں ہو سکتی ہیں لیکن شہر میں کوئی ڈیرہ داری نہیں ہے۔ اس کی وجہ آبادکاروں کی اکثریت ہے۔ اپنے علاقوں میں تو ان کی وسیع و عریض Establishments ہیں لیکن یہاں غالباً ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ صبح کام کے لئے آنا بھی ہو تو شام کو واپس چلے جاتے ہیں۔

شہر میں ویسے تو خاصے متمول آدمی ہیں جن میں سیٹھ اسلم کا ذکر ہو چکا ہے لیکن ایک شخص کا ذکر کیے بغیر رحیم یار خان کا تشخص نہیں اُبھرتا اور وہ چوہدری منیر ہے۔ اس کا تعلق ارائیں برادری سے ہے۔ چوہدری ہدایت اللہ کے اس فرزند ارجمند نے جو ترقی کی ہے اس کا الفاظ احاطہ نہیں کر سکتے۔ اگر کسی نے Self made کے معنی جاننے ہوں یا امیر بننے کا گر سیکھنا ہو تو اسے چوہدری سے ملنے کا مشورہ دیا جا سکتا ہے۔ خوبصورت، ملنسار، He lives in grand style ان کا مطبخ، رہائش اور لائف سٹائل کسی طرح بھی شیخوں اور شاہوں سے کم نہیں ہے۔ عمدہ گاڑیاں تو خیر سبھی امیر آدمیوں کے پاس ہوتی ہیں، سواری کے لئے دو تین جہاز بیک وقت رکھنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ چیف سیکرٹری اور آئی جی کو میں نے اس کے فارم ہاؤس پر ٹھہرایا تو چیف سیکرٹری کہنے لگے "شاہ صاحب! میں زندگی میں اس قسم کے کمرے میں نہیں ٹھہرا ہوں لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ اس وقت چوہدری منیر ایک اُبھرتا ہوا بزنس مین تھا۔ ایک دفعہ احباب میں ہمارے تعلقات کا ذکر ہوا تو ایک دوست ازراہ تفنن بولے "تم دونوں نے بڑی ترقی کی ہے!"

"وہ کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

بولے "تم گریڈ اکیس میں آ گئے ہو اور چوہدری منیر کا شمار پاکستان کے پہلے اکیس خاندانوں میں ہوتا ہے۔"

[جاری ہے۔]

غزل

دستِ ہَوا سے پرتوِ ادراک ہو گئے
بادل بکھر کے دامنِ صَد چاک ہو گئے

تیز اس قدر تھی اپنی اَنا کی ہوا ، کہ ہم
آوارہ صورتِ خس و خاشاک ہو گئے

اظہار پا کے بھی وہ کب اظہار پا سکا
بے ربط لفظ ، درد کی پوشاک ہو گئے

کس شان سے اُٹھے تھے بگولے جہت جہت
کیوں ٹوٹتے ہی سحرِ ہَوا ، خاک ہو گئے

بیٹھے ہیں دِل میں خنجرِ حالات گھونپ کر
مظلوم تھے مگر بڑے سفّاک ہو گئے

افکارِ نَو کے تیر ترازو ہیں ذہن میں
وہموں سے پُر خیال کے فتراک ہو گئے

عرفانِ فن ذرا ہوا حاصِل ہمیں تو ہم
اِظہارِ ذات میں بڑے بے باک ہو گئے

خالد ، خلا خلا وہی سودائے آگہی
صحرا نورد راہیٔ افلاک ہو گئے

خالد احمد

غزل

بے حضوری ہے اور غفلت ہے
اس خرابے میں ہم کو فرصت ہے

وقتِ رخصت یہی عطا کرنا
ایک آنسو ہماری قیمت ہے

جا کے کھولے کسی ٹھکانے سے
اس لفافے میں دل کی حسرت ہے

پھول ڈرتے ہیں زرد موسم سے
سب کی اڑتی ہوئی سی رنگت ہے

یار سن کر ہرے ہوئے کیسے
میرے غم میں بلا کی شدت ہے

عاجزی کا وقار کیا کہنا
خاکساری میں میری عزت ہے

چاہتوں کا غلام ہو جاؤں
نفرتوں سے مجھے تو نفرت ہے

میرا کاسہ تہی نہیں ثاقبؔ
اس میں مانگی ہوئی محبت ہے

آصف ثاقب

غزل

کہاں آزاد تھے اتنے کہ کچھ تکرار کرتے
سو کیا کرتے نہ گر سونپا گیا کردار کرتے

جو ذرّہ بھر جنوں ہوتا تو یوں ہوتا یقیناً
وہ جس سے روکتا ہم کو وہی سو بار کرتے

دکھا جاتا ہے خود حرفِ صداقت اپنی طاقت
دلائل ہوں تو پھر لہجہ نہیں تلوار کرتے

تمہارے حق میں پھر بھی فیصلہ آنا نہیں تھا
تم اپنی بھی صدائے دل اگر معیار کرتے

تمہارا بس نہیں چلتا وگرنہ شہر سارا
چڑھا دیتے صلیبوں پر، سپردِ دار کرتے

بسائی اک جدا دنیا رجا جینے کی خاطر
بتائی عمر اپنے درد کو اشعار کرتے

مکمل ہو گئی اپنی محبت کی کہانی
جفا جَرتے، انا ہرتے، وفا اظہار کرتے

کشیدے گر نہیں ہوتے سخن خونِ جگر سے
تو اپنے حرف عالی کب دلوں تک مار کرتے

جلیل عالی

غزل

اگرچہ اپنا یہاں کوئی ترجماں کہاں ہے
مگر ہماری کتھا کسی سے نہاں کہاں ہے

طرح طرح کی ہیں بولیاں اک بیاں کہاں ہے
رواں ہیں دو چار ٹولیاں کارواں کہاں ہے

اک اُس سے نسبت ہی اپنی پہچان ہے وگرنہ
جہاں میں کوئی ہمارا نام و نشاں کہاں ہے

اگر نہیں چشمِ دل ہی وا تو خبر بھی ہو کیا
کہ اُس کا پرتَو کدھر کدھر ہے کہاں کہاں ہے

یہ تُو جو بس دشمنی میں دہرائے جا رہا ہے
گھڑی ہوئی ہے تری ، مری داستاں کہاں ہے

جلیل عالی

ہمیشہ بارِ وفا ہی کردار تولتا ہے
تمھیں ہوا کب سبک، ہمیں یہ گراں کہاں ہے

یہ کائنات آج جن حسابوں کھلی ہے ہم پر
یقیں بھی کب ہے یقیں، گماں بھی گماں کہاں ہے

تلاش میں عمر کٹ گئی پھر بھی کھل نہ پایا
ہماری دنیا کدھر ہے، اپنا جہاں کہاں ہے

ہم ایک مجہول زندگی جی رہے ہیں عالی
غنا بھی کب ہے غنا، فغاں بھی فغاں کہاں ہے

غزل

جو مری غزل میں غزال تھا ، وہ کمال تھا
وہ جو تیرا عکسِ جمال تھا ، وہ کمال تھا

سبھی زاویے ، سبھی دائرے ، اُسی لہر کے
وہ جو میرا نقشِ خیال تھا ، وہ کمال تھا

مری زندگی جو گزر گئی تری دید میں
نہ وہ ماہ تھا ، نہ وہ سال تھا ، وہ کمال تھا

تری یاد میں گُل تازہ بن کے مہک اُٹھا
جو ترے فراق میں حال تھا ، وہ کمال تھا

وہ شجر تھا کوئی کہ جس کے نیچے ملے تھے ہم
کوئی خواب تھا ، کہ خیال تھا ، وہ کمال تھا

مری چشم شوق کے آئینے میں جو حرف تھا
مری زندگی کا سوال تھا ، وہ کمال تھا

ابھی پرفشاں ہے ، وہ کربلا کی فضاؤں میں
وہ جو روپ وقتِ زوال تھا ، وہ کمال تھا

جو تمھارے رُخ ، پہ کرن کی طرح بکھر گیا
وہ جو میرا حسنِ خیال تھا ، وہ کمال تھا

جمیل یوسف

غزل

لاکھ یہ امتحان سخت نہیں
کامیابی کی کوئی شرط نہیں

وقت سے بات چیت کیسے کریں!
یہ بھی تو سوچنے کا وقت نہیں

ایسے حالات میں جیئے جانا
خود پہ اک ظلم ہے ، یہ ضبط نہیں

آپ کا نام زندگی ہے کیا؟
آپ کی گفتگو میں ربط نہیں

کیا سفر میں کہیں پڑاؤ کریں
شب گزاری کا بندوبست نہیں

اپنے سائے میں بیٹھنا ہو گا
دشت میں دور تک درخت نہیں

گر کے اُٹھنے کا حوصلہ ہو تو
پھر سے گرنا کوئی شکست نہیں

آپ کا قد ہے آپ کا کردار
کچھ بھی ورنہ بلند و پست نہیں

بات کر پھاڑ کر گریباں کو
کام دے گا یہاں پہ ضبط نہیں

بے وفائی سرشت میں اسکی
صاحبِ تخت کا بھی تخت نہیں

ریت کیوں پڑ رہی ہے آنکھوں میں
ہم جہاں ہیں یہ کوئی دشت نہیں

دل وہ قابل نہیں بھروسے کے
درد کی مہر جس پہ ثبت نہیں

اُس کو کچھ اور نام دے دیجے
عشق وہ کیا کہ جس میں ضبط نہیں

نیند چھانے لگی ہے محفل پر
اور ابھی داستاں کا وسط نہیں

اُس کو کیا کارواں چلے نہ چلے
جس مسافر کے پاس رخت نہیں

زندگی ہے تو اک سفر امجد
اس میں پر واپسی کی شرط نہیں

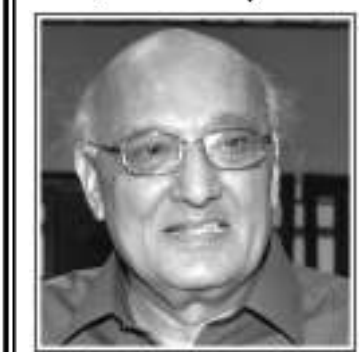

امجد اسلام امجد

غزل

کچھ کم تو نہیں آج گرانی مرے مولا
اب مفت کہاں ملتا ہے پانی مرے مولا

اب جان ہی ارزاں ہے کوئی بیچ کے دیکھے
کیوں خاک برابر ہے جوانی مرے مولا

مقتل کے مشابہ ہوا یہ شہرِ نگاراں
باقی نہ رہی کوئی نشانی مرے مولا

دیکھے ہیں ہر اک موڑ پہ نفرت کے الاؤ
مشکل ہے بہت آگ بجھانی مرے مولا

ٹھہری نہ غزل کوئی ترانہ ہمیں بھائے
دہشت کی رہی صرف کہانی مرے مولا

ہر سمت اداسی کا سماں قریۂ جاں میں
کوئی بھی نہیں شام سہانی مرے مولا

انبار ہیں لاشوں کے، مذمت کے بیاں ہیں
بڑھتی ہی گئی شعلہ بیانی مرے مولا

سرخم ہے، زباں گنگ ہے آنکھوں میں نمی ہے
شعروں میں نہیں کوئی روانی مرے مولا

میں قصۂ غم کس کو سناؤں یہ بتا دے
اپنوں نے مری بات نہ مانی مرے مولا

حسن عسکری کاظمی

غزل

روشنی آنکھ میں اتر آئے
دل کو صورت کوئی نظر آئے

کارفرما ہو صدق حرفوں میں
لفظ و معنی میں پھر اتر آئے

دوستی آبلوں سے اچھی ہے
کیا خبر راہ پر خطر آئے

راحتیں اس کے پاؤں پڑتی ہیں
آزمائش سے جو گزر آئے

دست و بازو کا پھر ہنر مانیں
راستے میں اگر بھنور آئے

آنکھ پر بار ہے ستم خیزی
آنکھ کیسے نہ روز بھر آئے

دم بہ دم ہو ریاض ضو افشاں
تیرگی زیر ہو ، سحر آئے

سید ریاض حسین زیدی

غزل

انت ہے میرے انتظار میں گم
اور میں حالتِ فرار میں گم

آپ بیتی! نہ پوری ''جگ بیتی''
ہر کہانی ہے اختصار میں گم

دور کی روشنی سواری پر
تیز رفتاریاں سوار میں گم

جھانکتا ہے خبر سے نامعلوم
ایک معلوم کے حصار میں گم

ہر نظریہ ہے آزمائش میں
ہر علامت ہے انتشار میں گم

ہر یقیں ایک وہم کی زد پر
ہر گماں ایک اعتبار میں گم

فہم سے بھاپ بن رہا ہے وجود
بے شماری سی ہے شمار میں گم

ایک بس آدمی ہے سو وہ بھی
ہو گیا اپنے اختیار میں گم

لوگ کیوں پھر ہمیں برا کہتے
ہم جو رہتے خیالِ یار میں گم

آدمی عشق کے نشے میں غرق
عشق تھہیمِ روزگار میں گم

ایک عرصے سے دونوں بیٹھے ہیں
ایک دوجے کے انتظار میں گم

اور رفاقت بھی اس کی کیا محسن
اک ستارہ ہو جیسے غار میں گم

محسن اسرار

غزلیں

تیغ سونتی ہُوئی ہے، تیر چلائے ہُوئے ہیں
ہم لڑائی میں مگر ہوش گنوائے ہُوئے ہیں

عقل کے مشوروں نے خوار کیے رکھا ہمیں
دل کی مانی ہے تو پھر صاحبِ رائے ہُوئے ہیں

کوئی رستہ نہیں سر پھوڑ کے مرنے کے سوا
زندگی! ہم جو ترے نرغے میں آئے ہُوئے ہیں

پتھروں ہی سی اگر خصلتیں دینا تھیں انھیں
آدمی کس لیے مٹی سے بنائے ہُوئے ہیں

تیری باتوں میں نہیں آنے کے دنیائے دنی
ہم کہ ہشیار ہیں اور گھومے گھمائے ہُوئے ہیں

کیسے کہہ دُوں کہ مرے پیچھے پڑی ہے دُنیا
میرے اعمال مرے سامنے آئے ہُوئے ہیں

زندگی کوہِ گراں ہے تو کوئی بات نہیں
تیشہ اِک نامِ خدا ہم بھی اُٹھائے ہُوئے ہیں

خاور اعجاز

اَب کے تیور جو مرے تیغ و تبر کے بدلے
رسن و دار بھی کٹ سکتے ہیں سر کے بدلے

ہم جلیسوں نے فقط شعر گھڑے ہیں یا پھر
کچھ معانی بھی کہیں زیر و زبر کے بدلے؟

سینچتے رہتے تھے جو اشکِ رواں سے ہم لوگ
شجرِ زیست پہ غم آئے ثمر کے بدلے

نہ وہ سورج ہی رہا اَور نہ مہتاب وہی
کون پھر طور مرے شام و سحر کے بدلے

آخرِ کار نہ پہنچے کسی منزل پہ بھی وہ
راستے اپنے جنھوں نے بھی سفر کے بدلے

غزل

ہم چلے اِس دشتِ ہُو کے اُس طرف
یعنی اپنے کاخ و کُو کے اُس طرف

جستجو کا تو جو حاصل ہے، سو ہے
جانے کیا ہے جستجو کے اُس طرف!

ایک سناٹے کی آوازیں بھی ہیں
ایک شورِ ہاؤ ہو کے اُس طرف

رنگ و بُو کے سلسلے ہیں اَور بھی
اِس جہانِ رنگ و بُو کے اُس طرف

منتظر میرا کئی صدیوں سے ہے
ایک صحرا، آبجُو کے اُس طرف

اِک خموشی اِس طرف پھیلی ہوئی
اِک خموشی گفتگو کے اُس طرف

رقص میں ہے اِک زوال آمادگی
شِدّتِ شوقِ نمو کے اُس طرف

حسرتوں کا ایک قبرستان ہے
میرے شہرِ آرزو کے اُس طرف

ایک گردش اَور بھی دیکھی گئی
گردشِ جام و سبو کے اُس طرف

'میں' یقیناً مجھ میں بھی ہے تو سہی
پائی جاتی ہے یہ 'تُو' کے اُس طرف

کیوں دکھائی دے رہا ہوں مَیں اِدھر؟
جب کھڑا ہوں خوبرُو کے اُس طرف!

دیکھتا ہوں مَیں تو بس اُس کو نسیم
جو چھپا ہے روبرو کے اس طرف

نسیمِ سحر

غزل

بشیر رزمی

خوبصورت نہیں ہو ، پیارے ہو
غم کے گرداب میں کنارے ہو

ڈگمگاتے ہوئے زمانے میں
گرنے والے کو اک سہارے ہو

غم فریبی سی غم فریبی ہے
غم فریبی کے استعارے ہو

سارے رخشاں نقوش دیکھتا ہوں
چاندنی رات کے ستارے ہو

جیتنا ہارنا مقدر ہے
تم نہ جیتے کبھی ، نہ ہارے ہو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن، شب سے جدا ہے نہ الگ عیب، ہنر سے

غزل

آسماں کی اُدھر جفا دیکھیں
میں زمیں ہوں مری وفا دیکھیں

لڑ رہا ہوں بھنور سے اَب تنہا
میری ہمت بھی ناخدا دیکھیں

یہ مقدر ہے عشق والوں کا
جور ہر حال میں روا دیکھیں

خاک کا اِک حقیر ذرہ ہوں
ابتدا میری انتہا دیکھیں

بال و پر والے سب ہی اُڑتے ہی
ہو کے بے بال و پر اُڑا دیکھیں

مٹ گیا ہے وہ راہِ الفت میں
کیا ملا ہے اُسے صلہ دیکھیں

جس کے چرچے ہیں چارسو جگ میں
ہے یہ زندہ یا مَر گیا دیکھیں

جو صدا سن لیں ڈوبتے دل کی
موت کا لب پہ ذائقہ دیکھیں

روز مرَ مرَ کے ہی وہ جیتے ہیں
حسن والوں کی جو ادا دیکھیں

سچ کی خاطر جو دار پر جھولیں
حوصلے اُن کے باخدا دیکھیں

زندہ رہنا نہ موت ہی بس میں
زندگانی کا ماجرا دیکھیں

جن کے بس میں سکونِ عامہ ہے
اُن کا قد سب سے ہی بڑا دیکھیں

اُس نے اوڑھا ہے زندگانی کو
آفریں کی بھی یہ خطا دیکھیں

رشید آفرین

غزل

حدِ موج و ساحل پر ناگہاں جلا ڈالیں
ہم نے عشق ہوتے ہی کشتیاں جلا ڈالیں

حسن میں وہ آتش تھی حسن تھا وہ آتش میں
بے ارادہ ہم نے بھی انگلیاں جلا ڈالیں

چند خوش جمالوں کے منتشر خیالوں میں
ہم نے ان گنت شمعیں رایگاں جلا ڈالیں

خواب اپنی آنکھوں کے کس کی نذر کر ڈالے
مشعلیں کہاں کی تھیں اور کہاں جلا ڈالیں

جن رفاقتوں میں ہم جلتے بجھتے رہتے تھے
سیلِ آب و آتش کے درمیاں جلا ڈالیں

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات نے ایسی خاک اڑائی
دن بھی بھبھوت سا مل کر آیا

غزل

نجانے کیسے لپٹ گئی ہیں مرے بدن سے ہزار آنکھیں
میں سونا چاہوں، تو سونے دیتی نہیں مجھے سوگوار آنکھیں

کسی پہاڑی پہ جا کے تنہا، گئے دنوں کو بلا کے تنہا
میں جب بھی رویا، تو میرے ہمراہ روئیں وہ آبشار آنکھیں

جہاں ملے تھے تم آخری بار، دل گرفتہ، بہ چشم گریاں
پڑی ملیں گی اُسی جگہ آج بھی سرِ کوہسار آنکھیں

گئے تھے جس دم سفر پہ تم، دو چراغ جلتے تھے زیرِ ابرو
اب آئے ہو تو دریدہ دامن، لہو بدن، تار تار آنکھیں

میں واپس آیا، تو میرے آنے تلک قیامت گزر چکی تھی
مگر بچھی تھیں تمام رستوں پہ جا بجا بے شمار آنکھیں

کبھی مجھے دُور سے بلاتی، کبھی مجھے دیر تک رُلاتی
دکھائی دیتی ہیں اب بھی کھڑکی کے پار وہ گریہ بار آنکھیں

بس اتنا سا یاد ہے کہ اک دن وہ اُتریں آبِ حیات لے کر
مگر نہیں اتنا یاد، پھر کیسے لے گئیں سُوئے دار آنکھیں

اگر کبھی تم محبتوں کے سفر پہ نکلو، تو یاد رکھنا
اسی سفر میں ہوئے ہیں اکثر دھواں دھواں دل، غُبار آنکھیں

اگر تمھیں اُس سے پیار ہے تو، اُسے کوئی اور دکھ نہ دینا
اسے کبھی نہ دکھانا جا کر یہ زرد چہرہ، فِگار آنکھیں

کسی دریچے کے طاق میں ہی جلا جلا کر اگر بُجھا دیں
انیسِ جاں! پھر کہاں سے لاؤ گے مانگ کر تم اُدھار آنکھیں

محمد انیس انصاری

غزل

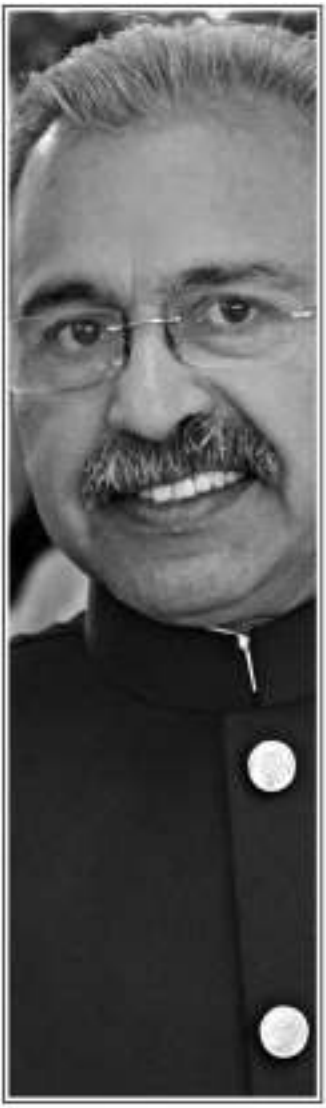

رات، فٹ پاتھ، نشہ، قربتِ دل جُو اُس کی
مجھ کو تھامے ہوئے چلتی رہی خوش بُو اُس کی

پنکھڑی جیسے وہ لب اور صراحی سا بدن
آنکھ کو دیکھتے رہ جاتے ہیں آہو اُس کی

اس لیے خوف اُسے موجِ سمندر کا نہیں
پرورش کرتے رہے ہیں مرے آنسو اُس کی

آج بھی رکھی ہوئی ہے وہ لگا کر دل سے
میں نے تصویر جو کھینچی تھی لبِ جو اُس کی

جان دے دیتا ہے مالک کے لیے کیوں کتا
کر نہیں سکتے وضاحت کبھی بچھو اُس کی

غم جو دن رات تجھے چاٹ رہا ہے راحتؔ
زندگی میں تو نہیں ملنے کی دارو اُس کی

پر نکلنے سے یہ معلوم ہوا ہے راحتؔ
اس اسیری میں بھی رہ دیکھتا ہے تُو اُس کی

راحت سرحدی

غزل

کٹے خود اس سے ، رہا یہ ملال البتہ
کہ خود غرض تھا وہ ، تھا باکمال البتہ!!

سکونِ قلب گنوائے تو ایک عمر ہوئی
کما لیا بڑا مال و منال البتہ

یہ پہلی بار نہیں اس نے دام پھیلایا
زمیں کے رنگ کا تھا اب کے ، جال البتہ

خدا کے بندوں کو تم سبز باغ دکھلاؤ
ہمارے واسطے ہے یہ محال البتہ

یہ کیوں کہیں کہ ملے ہی نہیں ہیں اچھے لوگ
ملے ، ضرور ملے ، خال خال البتہ

نعیم ان کے لبوں پر ہے مہرِ خاموشی
جبیں پہ ہے عرق انفعال البتہ!

سید ضیاالدین نعیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

فلک ستارہ تہی ، آنکھ نم تہی خالد
یہ دکھ نمو سے تہی بادلوں کے ساتھی ہیں

غزل

آپ اپنا جواب رکھ دینا
جھیل میں ماہتاب رکھ دینا

مفلسی میں شباب رکھ دینا
آگ میں اک گلاب رکھ دینا

حُسن اور عشق کی کہانی میں
اک گھڑا، اور چناب رکھ دینا

میرے ساقی بہت اندھیرا ہے
جام میں آفتاب رکھ دینا

رات کو جھیل کے کناروں پر
جگنوؤں کی کتاب رکھ دینا

دل کی بستی اُجالنے کے لیے
روشنی بے حساب رکھ دینا

میں جو گھبراؤں میری آنکھوں میں
کچھ دھنک رنگ خواب رکھ دینا

کوئی تتلی کبھی تو آئے گی
میرے گھر میں گلاب رکھ دینا

عقیل رحمانی

غزل

رکھتے ہیں تب و تاب عجب ذات میں جگنو
ٹوٹے ہوئے تارے ہیں کہ برسات میں جگنو

شہروں سے نکالا انھیں مسموم فضا نے
ملتے ہیں درخشندہ مضافات میں جگنو

نازک ہیں بہت بند انھیں مٹھی میں نہ کرنا
دم توڑ نہ دیں حبس کے حالات میں جگنو

لگتا ہے کہ پر جلتے چراغوں کو لگے ہیں
دیکھے کوئی اُڑتے ہوئے ظلمات میں جگنو

دن میں کبھی آتے نہیں سورج کے مقابل
کرتے ہیں عیاں اپنی چمک رات میں جگنو

گلزار پرندوں کو بھٹکتے ہوئے پاکر
رہبر ہوئے تاریک مقامات میں جگنو

گلزار بخاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک محفلِ سخن تھی سو برپا تھی، ہم بھی تھے
لیکن کوئی شکیبؔ نہ تھا ، جعفریؔ نہ تھا

غزلیں

یاد آیا ہے اچانک جو کوئی ، آخرِ شب
اشک آنکھوں سے رواں ہیں کہ جھڑی، آخرِ شب

دردِ دل میں بھی کمی آ ہی گئی ، آخرِ شب
تیرے آنے کی خبر ایسے ملی ، آخرِ شب

مے کشو ، وقت نکالو پئے بادہ نوشی
مل کے بیٹھیں گے کہیں چار گھڑی، آخرِ شب

تم نے جانا تھا تو چپکے سے چلے ہی جاتے
تم نے کیا سوچ کے یہ بات کہی ، آخرِ شب

عمر ڈھلتے ہی ہر اک شے پہ زوال آتا ہے
روشنی چاند کی بھی ختم ہوئی ، آخرِ شب

ابھی سورج کے نکلنے میں ہیں لمحے، کافی
ایک ساغر ہی ذرا اور سہی ، آخرِ شب

آنکھوں آنکھوں میں کٹی جوشبِ ہجراں، شوکتؔ
یاد، پھر آئی ہمیں دل کی لگی ، آخرِ شب

شوکت محمود شوکت

روز کہتی ہے یہی دل کی لگی ، آخرِ شب
ان سے ملنے کی ہو تدبیر کوئی ، آخرِ شب

چین آئے نہ ہمیں ایک گھڑی، آخرِ شب
یاد آتی ہے بہت ، ایک گلی ، آخرِ شب

نام ، اُلفت کا زمانے میں نہ لینا ہرگز
ایک پاگل نے صدا زور سے دی، آخرِ شب

صبح ہونے کے نظر آتے نہیں ہیں آثار
چاند تاروں کی ہے کیا ست روی آخرِ شب؟

شائبہ، سب کو ہوا ہے شبِ دیجور کا، پھر
اُس نے گیسو جو سنوارے ہیں کبھی، آخر شب

نیک جانیں گے اسے، دن کے اجالے میں سبھی
بزمِ مستاں میں پڑا ہے جو ابھی ، آخرِ شب

چہرہ خورشید کا اس نے نہیں دیکھا، شوکتؔ
کِھل گئی بھول کے جو کوئی کلی ، آخرِ شب

غزل

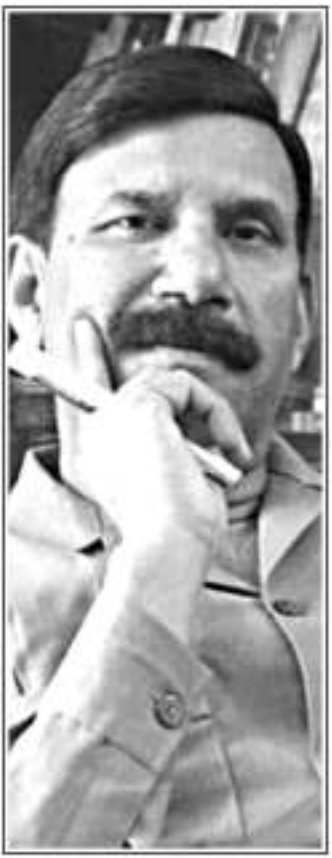

دھوپ سے رشتہ ہے لیکن سائبانوں کی طرح
ہم زمیں پر بھی رہے تو آسمانوں کی طرح

تب سے اُس کی دشمنی پر اعتبار آنے لگا
مشورے دیتا ہے جب سے مہربانوں کی طرح

رات بھر عرضِ تمنا، صبح کو فکرِ معاش
ہر گھڑی گزری ہے مجھ پر امتحانوں کی طرح

مے کدہ، ساقی، صراحی اور ساغر آج بھی
یاد آتے ہیں مگر گزرے زمانوں کی طرح

موت صحرا میں چمکتے پانیوں کا سلسلہ
زندگی برسات میں کچے مکانوں کی طرح

یونس خیال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تہِ آسمانِ دُنیا ، سرِ خاک دانِ دنیا
مرے ساتھ ساتھ رہنا، مجھے سائے سائے رکھنا

غزل

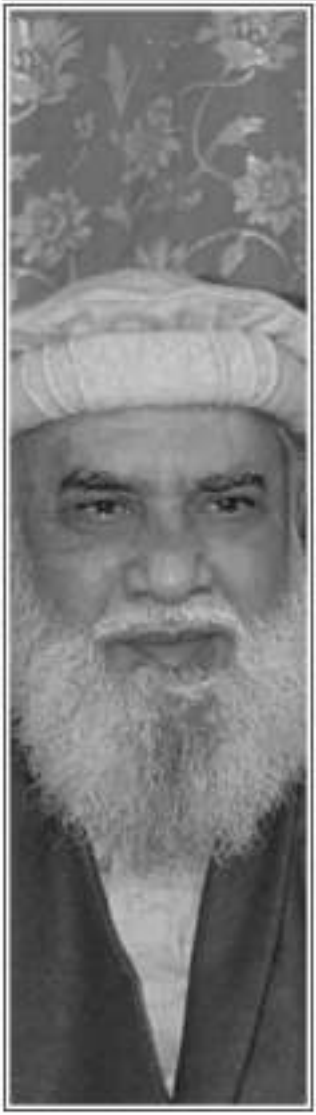

اک بات تو طے ہے کہ نہیں جاؤں گا ٹل کر
اے مالک و مختار ! مرے مسئلے حل کر

کہتے ہیں رفاقت کسے ،آ اس کا مزہ لے
دو چار قدم دیکھ مرے ساتھ بھی چل کر

سوچو تو ،کہ کیا اب بھی مری قوم کے بچے
تیغوں کے ہی سائے میں جواں ہوتے ہیں پل کر

کس حال میں ہے ظل الٰہی کی رعایا
بازار میں آ ، دیکھ کبھی گھر سے نکل کر

جو دیکھ رہا ہوں میں ، کوئی خواب نہیں ہے
سو بار تو میں دیکھ چکا آنکھوں کو مل کر

کوئل کا ہے بچہ تو وہ کوئل ہی بنے گا
کوے کے گھروندے میں بھی انڈے سے نکل کر

سمجھا دی ہے کس طور پہ دنیا کی حقیقت
مچھلی نے دہکتے ہوئے انگاروں پہ جل کر

ہر روز نئے روپ میں ملتے ہیں مرے یار
آ جاتے ہیں ہر روز نئے سانچے میں ڈھل کر

ہاں یار ، مرا عشق نہیں قیس کے تابع
صحراؤں میں کیوں بھٹکوں میں بستی سے نکل کر

اکرم ناصر

غزل

ہر غم سے نجات ہو گئی ہے
اُن سے مری بات ہو گئی ہے

دل اتنا خموش تو نہیں تھا
کیا اِس کی وفات ہو گئی ہے

دن رات گزر کے مشکلوں سے
آسان حیات ہو گئی ہے

بولو کہ رہِ وفا میں مَر کے
جیتے ہو کہ مات ہو گئی ہے

وہ جدّوجہد ، جو تھی اضافی
کیوں حصّۂ ذات ہو گئی ہے؟

کیوں دن کو بھی اب کچھ آنکھ والے
کہتے ہیں کہ رات ہو گئی ہے

تم کیوں ہو جلال سے گریزاں
کیا کوئی بات ہو گئی ہے

سید قاسم جلال

غزل

خزاں گزیدہ بہار ہونے سے رہ گیا ہوں
کسی کے دل کا قرار ہونے سے رہ گیا ہوں

رکی تو تھی میرے واسطے تیری پالکی بھی
مگر میں اس میں سوار ہونے سے رہ گیا ہوں

یہ شان مجھ کو ملی ہے نعتِ نبی کے صدقے
میں عاصیوں میں شمار ہونے سے رہ گیا ہوں

مرا یہ ہونا بھی ایک ہی مرتبہ ہوا ہے
میں چاک پر بار بار ہونے سے رہ گیا ہوں

مری بھی خواہش تھی میں بھی بحرِ عظیم ہوتا
نہ جانے کیوں بے کنار ہونے سے رہ گیا ہوں

محبتوں میں مجھے حکومت ملی نہیں ہے
میں صاحبِ اقتدار ہونے سے رہ گیا ہوں

مجھے تو اقبال پھول بننے کی آرزو تھی
عجیب قصہ ہے خار ہونے سے رہ گیا ہوں

اقبال سروبہ

غزل

ہر ایک شخص دبائیں اُٹھائے پھرتا ہے
طرح طرح کی بلائیں اُٹھائے پھرتا ہے

یہ کیسا خوف ہے دنیا پہ آج چھایا ہوا
کفن فروش قبائیں اُٹھائے پھرتا ہے

خدائے پاک کا ہم پر کرم ہے ہر لمحہ
ہمیں جو بائیں سے دائیں اُٹھائے پھرتا ہے

فقیرِ راہ دعاؤں کی شکل میں اب بھی
طرح طرح کی دوائیں اُٹھائے پھرتا ہے

غریبِ شہر پہ رحمت خدا ہی فرمائے
دعا کو اپنی ردائیں اُٹھائے پھرتا ہے

ہوائے دشتِ قضا سر بسر ہے عالم میں
ہجوم پھر بھی قبائیں اُٹھائے پھرتا ہے

ہماری سوچ بھی اک لاش ہے کہ وقت جسے
جدھر جدھر کو بھی جائیں، اٹھائے پھرتا ہے

بس ایک درد کا مارا، زمین زادہ بھی
زمیں کی ساری بلائیں اُٹھائے پھرتا ہے

اسے خبر ہے کہ مقتل میں مارا جائے گا
مگر وہ پھر بھی صدائیں اُٹھائے پھرتا ہے

فرحت عباس

غزلیں

دھوپ چھاؤں سے پوچھ لیتے ہیں
کچھ ہواؤں سے پوچھ لیتے ہیں

شہر بننے کی آرزو ہے تمہیں؟
آؤ گاؤں سے پوچھ لیتے ہیں

کوئی سمجھوتہ ہو بھی سکتا ہے؟
انتہاؤں سے پوچھ لیتے ہیں

دنیاداری کی یاد آتی ہے؟
راہباؤں سے پوچھ لیتے ہیں

منظور ثاقب

کبھی کبھی تو یوں حد سے گزرنے لگتے ہیں
نہیں کیا تھا کبھی جو وہ کرنے لگتے ہیں

ہوائے ناز چلے تو گداز ساحل پر
محبتوں کے سفینے اترنے لگتے ہیں

نگاہ ناز کے پر کیف ایک لمحے سے
نہ جانے کتنے زمانے سنورنے لگتے ہیں

خنک سی رات میں پا کر تمہاری یاد کا چاند
فلک سے شوخ ستارے اترنے لگتے ہیں

کیا خدا سے بھی کوئی رشتہ ہے ؟
ناخداؤں سے پوچھ لیتے ہیں

راستہ مے کدے کا ثاقب جی
پارساؤں سے پوچھ لیتے ہیں

جو ڈوب جاتی ہے بستی کوئی کسی لمحے
کچھ اگلے لمحے جزیرے ابھرنے لگتے ہیں

نہیں جو رکھتے ہیں لوگوں سے رابطہ ثاقب
وہ دھیرے دھیرے ستم کیش مرنے لگتے ہیں

غزل

ہمیں قسمت سے لڑنا پڑ گیا تھا
تصور ضد پہ اڑنا پڑ گیا تھا

طلب جنت کی دل میں آگئی تھی
سو ماں کے پاؤں پڑنا پڑ گیا تھا

خزاں میں زرد پتوں کو شجر سے
تواتر سے ہی جھڑنا پڑ گیا تھا

چُھڑا کر ہاتھ اپنا چل دیئے وہ
سرِ راہے بچھڑنا پڑ گیا تھا

اُدھر صحرا میں خشکی بڑھ گئی تھی
سمندر کو سکڑنا پڑ گیا تھا

کسی کو تاابد خوش دیکھنا تھا
ہمیں آخر اُجڑنا پڑ گیا تھا

چلی تھی تیز آندھی اس طرح سے
درختوں کو اُکھڑنا پڑ گیا تھا

تری خاطر زمانے سے تصور
ہمیں لڑنا جھگڑنا پڑ گیا تھا

تصور اقبال

غزل

ایک چہرا بھی نہیں ہے جسے اپنا کہہ لیں
کوئی ایسا بھی نہیں ہے جسے اپنا کہہ لیں

خالقِ وقت! شب و روز کے اس جنگل میں
ایک لمحہ بھی نہیں ہے جسے اپنا کہہ لیں

دوپہر آئی ہمیں اجنبی چوراہے پر
اپنا سایا بھی نہیں ہے جسے اپنا کہہ لیں

آسماں آسماں پھیلے ہوئے اس دامن میں
اک ستارا بھی نہیں ہے جسے اپنا کہہ لیں

منزلوں منزلوں بیگانہ روی ہے ، حامد
ایک رستا بھی نہیں ہے جسے اپنا کہہ لیں

حامد یزدانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہجر کا غم کچھ اور ہے ، آنکھ کا نم کچھ اور شے
زیرِ چراغ آگہی نورِ ہنر نہیں تو کیا

غزل

اِک حادثاتی موت میں فکر و نظر گئے
جو نظریاتی لوگ تھے بے موت مر گئے

بے چہرگی کے خوف نے سب کو ڈرا دیا
جو رہبرِ حیات تھے، جینے سے ڈر گئے

عقل و شعور و درک کا خانہ خراب ہے
اب شامِ زُود خواب کے سائے اُتر گئے

لوحِ جمالیات پہ کندہ ہوس ہوئی
کیسے چراغ تھے کہ جو اندھیر کر گئے

ہر گام ایک آئنہ خانہ تو ہے مگر
اس کے ہوئے قریب جو بھی، بے بصر گئے

ٹوٹا پڑا ہے سلسلۂ واقعاتِ زیست
کڑیوں کو جوڑ صدیاں بناتے کدھر گئے

منظر تراش! چشمِ تصور میں جھانک، دیکھ
کیا سرسراتی روحوں کے پیکر سنور گئے

خوش فہمیوں کا پالنا آسان کام ہے
ہم لوگ حسن و خوبی سے یہ کام کر گئے

عہدِ زیاں کا بوجھ جو عمرِ رواں پہ تھا
اصغرؔ اسے اتارتے ہی اپنے گھر گئے

علی اصغر عباس

غزل

اب کیا تمہیں بتائیں کہ کب خاک ہو گئے
تب پوچھنے کو آئے ہو جب خاک ہو گئے

اک گرد تھی کہ پڑ گئی اجلے لباس پر
پھر یوں ہوا کہ نام ونسب خاک ہو گئے

مرتے ہوؤں نے سانس لئے اپنے آخری
اور اُس کے بعد نام ونسب خاک ہو گئے

کل تک میں دیکھتا تھا یہاں کیسے کیسے لوگ
اک ایک کرکے آخرش سب خاک ہو گئے

اُن کے بدن پہ کون سی مٹی کے رنگ تھے
مرنے سے جن کے عارض ولب خاک ہو گئے

افضل گوہر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ بھی کہنے کو نہ مانگا خالد
بات کہنے کو ہنر مانگ لیا

غزل

کیا عکس اور ان کے راز پڑھوں
آئینہ خود غماز پڑھوں

جو ہمرہ میری فکر کے ہوں
ان لفظوں کی پرواز پڑھوں

کیا سحر ہے دل کی آتش میں
پتھر کے بیچ گداز پڑھوں

تُو تتلی محوِ غنچہ ہو
اور میں تیرے انداز پڑھوں

لا دوست بچھا دامانِ قبا
میں اس پر آج نماز پڑھوں

اُڑ خوشبو تیرے رنگ چنوں
کھل رنگ ، تری آواز پڑھوں

اعجاز روشن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پھر وہی مہرباں ہوا آئی
اے مری بے چراغ تنہائی

غزل

یاد کی برف کو "پگھلاؤ" نہیں
موسموں کا یہاں برتاؤ نہیں

ہم نے برتا ہے بہر طور اسے
وقت کیا ہے، ہمیں سمجھاؤ نہیں

دل نہ سہ پائے گا سمجھوتا کوئی
خود کو دھوکا نہ دو، بہکاؤ نہیں

ہم کو بس ہے، دلِ اندیشہ گر
کچھ تکلف کوئی فرماؤ نہیں

صاف سیدھا ہے وگرنہ رستہ
رہروؤں کا ہی وہ برتاؤ نہیں

جی امنڈ آتا ہے، بیٹھے بیٹھے
گرچہ پہلے سا وہ چھلکاؤ نہیں

حرفِ یک پرسشِ احوال پہ کیا
بک ہی جائیں: نہیں اس بھاؤ نہیں

بجھ تو جاؤں گا دیا سا میں بھی
صبح ہو گی، کوئی پچھتاؤ نہیں

یار تو سب ہی محبت میں ہیں آگ
کچھ ہیں مخمور مگر تاؤ نہیں

یاد کر دن وہ، کبھی آگ تھے ہم
آگ اب کیا یہاں سلگاؤ نہیں

لب کو اب آنچ نہ دو، سرد رہو
داستاں ہو چکی، دہراؤ نہیں

دانتوں کھلتی ہے لگی ہاتھوں کی
ایسی ویسی تو قسم کھاؤ نہیں

بازیٔ عشق بھی کیا خوب رہی
جیت ہی جاتے، پڑا داؤ نہیں

یہی دل تھا چمن آثار کبھی
آن بیٹھے ہو تو اب جاؤ نہیں

طارق بٹ

غزلیں

اِدھر علم اُدھر مال و زر دے رہا ہے
سبھی کو نئی ظرف بھر دے رہا ہے

ساعت سے انڈیل کر رس بیاں کا
زبانوں کو نطق و اثر دے رہا ہے

وہ کرکے چراغاں سرِ طور منظر
اندھیرے میں رزقِ نظر دے رہا ہے

کسی دم کے آرام کا کرکے ساماں
کسی دم کو اذنِ سفر دے رہا ہے

شہاب اِن زمینوں زمانوں میں اُڑتا
غبار اک جری کی خبر دے رہا ہے

شہاب صفدر

خوشبو سی پھیل جاتی ہے سارے میں گفتگو
جس کُنج بھی کریں ترے بارے میں گفتگو

یہ سوچ کر ہیں عُمر کے اس موڑ پر خموش
اب فائدے میں ہے نہ خسارے میں گفتگو

وہ لب دکھا رہے تھے کسی خواب کی بہار
وہ آنکھ کر رہی تھی اشارے میں گفتگو

الفاظ اور معنی میں حائل ہے موج رنگ
اٹکی ہوئی ہے ایک نظارے میں گفتگو

خوش لہجہ ہم کلام ہوا تھا کوئی شہاب
محفوظ ہے وہ دل کے شمارے میں گفتگو

غزل

ذکی طارق

قرار و قول ابھی اس سے ہارتے رہنا
تم اس میں پیار کا جذبہ ابھارتے رہنا

وہ خواب جن کی نہ تعبیر پوری ہو پائے
تم اپنی آنکھوں میں ان کو اتارتے رہنا

نہ جانے کس گھڑی ہو جائے ملتفت وہ کریم
تم التجاؤں کا دامن پسارتے رہنا

تم اپنے چہرۂ زیبا کی اک جھلک دے کر
ہمارا حسنِ تخیل سنوارتے رہنا

اسی پہ ایک دن آ کر اُگے گا سورج بھی
یونہی ہتھیلی پہ جگنو اتارتے رہنا

یہ ریت پر نہیں جم پائیں گے مگر پھر بھی
نشان قدموں کے اپنے ابھارتے رہنا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس قدر کے پیروں میں نہ تھی جبر کی بیڑی
زندانِ اَنا میں بھی تھا زنجیر بہ پا میں

غزلیں

نکل کے دل سے بدن کی حدود میں بکھرا
یہ کیسا درد ہے میرے وجود میں بکھرا

لہو لہو تھا وہ مقتل کی حد پھلانگ گیا
مگر میں مر کے بھی تیری حدود میں بکھرا

گنوا دیا تھا بہت کچھ انا بچاتے ہوئے
جو بچ گیا تھا وہ نام و نمود میں بکھرا

جو ایک کھیل سمجھتا تھا عشق کو پہلے
پھر اس کے بعد اُسی کھیل کود میں بکھرا

یہ حسنِ ماہ و کواکب یہ رنگِ قوسِ قزح
تمھارا حسن ہے چرخِ کبود میں بکھرا

بڑی انیس تھی گمناموں کی دھند جلیل
مرا یہ آئنہ شہرِ نمود میں بکھرا

یہ جان ویسے بھی اک دن جلیل جانی تھی
ہزار شکر میں تیرے سجود میں بکھرا

احمد جلیل

آنکھوں کے دریچوں میں سجایا نہیں جاتا
گر جائے جو نظروں سے اُٹھایا نہیں جاتا

اس دشتِ تمنا میں مَیں جلتا ہوں شب و روز
جس سمت کبھی بھول کے سایا نہیں جاتا

ہم صبح کے بھولے ہوئے وہ لوگ ہیں جن سے
گھر شام کو بھی لوٹ کے آیا نہیں جاتا

ہر دل نہیں ہوتا ہے محبت کا سزاوار
ہر ساز پہ یہ راگ تو گایا نہیں جاتا

اب اس کو بھلانے کا ارادہ تو ہے لیکن
دریا کبھی الٹا بھی بہایا نہیں جاتا

سوچا ہے کئی بار نہ اب یاد کریں گے
کیا کیجیے وہ شخص بھلایا نہیں جاتا

یہ ہجر ہی کرتا ہے جلیل اپنا تعاقب
ہنس کر تو کوئی زہر بھی کھایا نہیں جاتا

غزلیں

خوشیوں کے دن کم ہوتے ہیں
باقی غم ہی غم ہوتے ہیں

بزمِ شبِ ہجراں میں اکثر
تم ہوتے ہو ہم ہوتے ہیں

یاد پرانی یاد آئے تو
منظر کتنے غم ہوتے ہیں

راہِ عدم کو جانے والے
کتنے تیز قدم ہوتے ہیں

وہ تلوار سے کب ڈرتے ہیں
جن کے ہاتھ قلم ہوتے ہیں

ہم جیسے بھی لوگ کرامتؔ
ہوتے ہیں پر کم ہوتے ہیں

کرامت بخاری

جب تری بات چل نکلتی ہے
آرزو کروٹیں بدلتی ہے
اک ترے ہمسفر نہ ہونے سے
راہ تاریکیاں اُگلتی ہے
کوئی دستار ہو کہ ہو دیوار
گر رہی ہو تو کب سنبھلتی ہے
برف پگھلے تو اس کی نسبت سے
ایک ندّی نئی نکلتی ہے
کچھ وہ بولیں تو ہم بھی بات کریں
بات تو بات سے نکلتی ہے

آپ کی محفلوں میں آ کر بھی
میری تنہائی ہاتھ ملتی ہے
جو زباں سے ادا نہ ہو پائے
بات وہ آنسوؤں میں ڈھلتی ہے
یہ کرامتؔ نہیں تو پھر کیا ہے
سانس رُکتی ہے نبض چلتی ہے

غزلیں

پیڑ سے جھڑتے ہوئے اِن پات سے
بات پیدا کر رہا ہوں بات سے

زندگی جیسے کوئی خالی مکاں
اور میں بھرپور امکانات سے

آنکھ میری تھی برسنا چاہتی
مسئلہ تھا شہر کو برسات سے

ایک دن پھر قحط پیدا ہو گیا
میرے گھر میں رزق کی بہتات سے

خواب میں بیٹھا ہوں اک اونچی جگہ
دل پریشاں ہے مرا کل رات سے

مغز ماری کون کرتا اِس قدر
میں نے سمجھوتا کیا حالات سے

دیکھیے اب جیت کس کی ہوتی ہے
چھیڑ دی ہے جنگ اپنی ذات سے

کیوں نہ جانیں گے مجھے تیرے شجر
پھل جو توڑے ہیں ترے باغات سے

اُس کو لنگر سے پڑا کھانا سحر
ہاتھ روکا جس نے بھی خیرات سے

سحر تاب رومانی

چاہتوں کے امیں چلے گئے ہیں
اِس مکاں سے مکیں چلے گئے ہیں

کہیں جاتے نہیں تھے لیکن آج
ہم اچانک کہیں چلے گئے ہیں

روشنی بزم شب میں تھی جن سے
وہ ستارہ جبیں چلے گئے ہیں

چند سامع ہیں اور میں ہوں اب
سارے مسند نشیں چلے گئے ہیں

آسمانوں کی گفتگو سُن کر
لوگ زیرِ زمیں چلے گئے ہیں

ہر شکایت تری بجا ہے مگر
ہم وہیں سے وہیں چلے گئے ہیں

کوئی آیا گیا کہاں ہے یہاں
ہم تھے آئے، ہمیں چلے گئے ہیں

اور کچھ تو نہیں تھا اپنے پاس
اعتبار و یقیں چلے گئے ہیں

اُس سے بچتے ہوئے سحر ہم تو
اور اُس کے قریں چلے گئے ہیں

غزلیں

پیشتر اس سے کہ کوئی کب خلاصہ کھول دے
تجھ کو میرا مشورہ ہے سب خلاصہ کھول دے

تو تو بہتر جانتی ہے ان اندھیروں کا مزاج
مر گئی ہے پھر کہاں اے شب، خلاصہ کھول دے

ان کنایوں کو سمجھنا ہر کسی کا بس نہیں
میرے کہنے کا ہے یہ مطلب خلاصہ کھول دے

لب کشائی کے تقاضے ہو گئے ازبر تجھے
اب کھلی چھٹی ہے تجھ کو اب خلاصہ کھول دے

دہر یہ ہے یا مسلماں، کچھ بھی تو کھلتا نہیں
کچھ تو آخر ہے ترا مذہب، خلاصہ کھول دے

بال کھولے رقص کرتی ہے جہاں آوارگی
بند ہونے کو ہے یہ مکتب، خلاصہ کھول دے

جھوٹ پر یہ بارشِ اکرام آخر کب تلک
دیر ہے پرواز کیسی اب خلاصہ کھول دے

یعقوب پرواز

رکھتے نہیں جو ناسخ و منسوخ کی خبر
ایسے مورخین کہاں کے ہیں معتبر

ملتا ہے یوں بھی کوششِ بے سود کا صلہ
ہر بار مجھ سے رہ گئی اک آنچ کی کسر

ڈرتا ہوں اس یقین پہ بجلی نہ گر پڑے
کوفے سے آ رہی ہے کوئی خیر کی خبر

ہنگامہ ہر کہیں ہے طلوع و غروب کا
کٹتی رہے گی زندگی کیا شام کیا سحر

کیوں بے خبر ہے عمرِ خضر کے مآل سے
کن واہموں میں غرق ہے اے عمرِ مختصر

ہر واہمے کو خانۂ دل سے نکال دے
سائے کی طرح ساتھ رہ اے عمرِ مختصر

ہر چند ہوں میں قریۂ گمنام کا مکیں
پہنچی مرے کلام کی شہرت نگر نگر

غزل

شہد و شراب و شیر سے کٹیا سجا بھی دی
درویش نے زمین پہ جنت بنا بھی دی

یہ کون عکس ہے مجھے اس کی خبر نہیں
میں نے تو ایک شکل کبھی کی بھلا بھی دی

اب اور مجھ سے چاہیے کیا اے مرے عزیز!
سر پہ بھی ہاتھ رکھ دیا، دل سے دعا بھی دی

میں کیا کروں کہ پھر بھی سفر ہو نہیں رہا
رستے سے کائنات خدا نے ہٹا بھی دی

آخر یہی کہ میں نے اسی چشمِ خشک میں
دریا بھی خلق کر دیا نیکی بہا بھی دی

قمر رضا شہزاد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاک داماں کیا ہوا؟ وہ حشر ساماں کیا ہوا؟
اے بیاباں! وہ غبارِ کوئے جاناں کیا ہوا؟

غزل

نیلما ناہید درانی

وہ جوابوں سے سوالوں سے سمجھتا ہے مجھے
اردو اخبار رسالوں سے سمجھتا ہے مجھے

میری مجبوری ہے کیا کتنے مسائل ہیں مرے
کچھ نہیں جانتا غزلوں سے سمجھتا ہے مجھے

دل کی پوشاک میں پیوند ہزاروں لیکن
وہ تو ان ظاہری شالوں سے سمجھتا ہے مجھے

لوگ جو کہتے ہیں وہ اس پہ یقیں رکھتا ہے
کیا ہے کردار مثالوں سے سمجھتا ہے مجھے

جس نے جانا ہی نہیں راز مری باتوں کا
وہ مرے خواب خیالوں سے سمجھتا ہے مجھے

کیا ہے پوشیدہ مرے ذہن میں کب جانتا ہے
میرے رخسار سے بالوں سے سمجھتا ہے مجھے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

حریصِ لذّتِ آزار خالد
کبھی ، ہم بھی ترے ساتھی رہے ہیں

غزل

آ چکا اسٹیج پر شعلہ بدن اپنی جگہ
کیسے بیٹھیں خامشی سے مرد و زن اپنی جگہ

ایک دوجے سے گلے ملنے کا فن اپنی جگہ
نفرتوں کے بیج بونے کا چلن اپنی جگہ

صرف تھوڑا سا انھیں غصہ دلا دیتا ہوں میں
خود بنا لیتی ہے ماتھے پر شکن اپنی جگہ

جانے کیا ہو گا مرے دولہا کا اب ردِعمل
ڈر رہی ہے دھو کے چہرے کو دلہن اپنی جگہ

رمز کل مجھ پر عیاں کی ایک بزنس مین نے
کاروبار اپنی جگہ ، حبِ وطن اپنی جگہ

تیرا یہ اعزاز ہے کہ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں لوگ
کون ورنہ چھوڑتا ہے جانِ من اپنی جگہ

اہلِ دل پہلے بدلتے ہیں نظر کا ذائقہ
بعد میں پھر لذتِ کام و دہن اپنی جگہ

داد دے سکتا ہوں پر بے وزن کہہ سکتا نہیں
حسنِ زن اپنی جگہ ، مشقِ سخن اپنی جگہ

بدر منیر

غزلیں

کوزہ گر چاک پہ رکھے یا اُتارے مجھ کو
کام اُس کا ہے وہ جیسے بھی سنوارے مجھ کو

اور مل جائے گا کوئی اسے اچھا مجھ سے
ہارنا ہے تو بڑے شوق سے ہارے مجھ کو

غم کی شدت میں جو ہنستا ہوں غضب لگتا ہوں
دیکھنے آتے ہیں سب درد کے مارے مجھ کو

میں ترے رنگِ محبت میں ہوا ہوں گل رنگ
اب یہ خواہش ہے کوئی روپ نہ دھارے مجھ کو

صورتِ حال کا اب صرف تقاضا ہے یہی
وہ مرے ساتھ رہے اور نکھارے مجھ کو

میں تو اس پر بھی ہوں خوش کارِ محبت میں اگر
فائدے اس کو ملیں اور خسارے مجھ کو

میں بھی روشن ہوں کسی چاند سے چہرے سے کمال
دیکھتے ہیں بڑی حسرت سے ستارے مجھ کو

اشرف کمال

اور کچھ دن مجھے جینے کی جو مہلت ملتی
یہ ضروری تو نہیں تیری محبت ملتی

خاک زادے کہاں تاروں کو پہنچ سکتے ہیں
کب یہ ممکن تھا کہ تم سے مری قسمت ملتی

میں نے اک عمر گزاری ہے تری صحبت میں
شہر والوں سے کہاں میری طبیعت ملتی

تیری تصویر میں رنگوں کی دھنک بھر دیتا
مجھ کو کچھ دیر جو رُکنے کی اجازت ملتی

تیرے کشکول میں بھر دیتا میں سانسیں اپنی
زندگی مجھ کو اگر حسبِ ضرورت ملتی

ہر طرف زاویے رنگوں کے بکھر جانے تھے
آئنے کو ترے چہرے کی بشارت ملتی

شہر والوں کے رویے کا کوئی رنج نہیں
گاؤں آ کر تو مجھے سچی محبت ملتی

غزلیں

قدم قدم پر ایک نئی ہلچل دیتا ہے
پہلے مشکل پھر مشکل کا حل دیتا ہے

میں بھی وہی لفظوں کی بساط بچھا دیتی ہوں
وہ بھی کوئی چال پرانی چل دیتا ہے

تلخی اپنی نوک زباں پر جم سی گئی ہے
ہم نے سنا تھا صبر تو میٹھا پھل دیتا ہے

پہلے دکھائے دور سے راہیں ہری بھری وہ
اور پھر چلتے جانے کو جنگل دیتا ہے

رخشندہ نوید

ہر ایک لحظہ رُخِ داستان بھی بدلے
وہ بات بات پہ اپنا بیان بھی بدلے

ہمارے سر سے کبھی غم کا آسماں نہ ہٹا
بدل کے دیکھ لی بستی، مکان بھی بدلے

کبھی یہ وہم ہوا سنگ اُٹھائے پھرتی ہے
کبھی یقین کہ یہ آسمان بھی بدلے

سرحد کے اس پار عجب سی خاموشی ہے
دشمن شاید رسّی کو پھر بل دیتا ہے

پہلو سے اُٹھتے اُٹھتے، جاتے جاتے وہ
کیسا رنگ مرے چہرے پہ مَل دیتا ہے

اُس ایک شخص نے بدلا ہے میرا منظر زیست
پھر اس کے بعد زمین و زمان بھی بدلے

بدل کے رکھ دوں سوالِ حیات رخشندہ
مگر یہ کمرۂ امتحان بھی بدلے

غزل

شک کی بنیاد پہ چشمے کو کنواں جانتا ہے
میرے پھیلے ہوئے بازو کو کماں جانتا ہے

میں نیا شہر میں آیا ہوں مجھے علم نہیں
راستہ پوچھنے والا یہ کہاں جانتا ہے

خود کو گرنے سے کئی بار سنبھالا میں نے
ایک لغزش کو مگر سارا جہاں جانتا ہے

باوجود اس کے کنارے پہ کھڑا ہوں لیکن
عکس کے بارے فقط آب رواں جانتا ہے

بولنے کے لیے الفاظ ضروری نہیں ہیں
عام سا شخص بھی جذبوں کی زباں جانتا ہے

جمع تفریق سے اندازہ نہیں ہو سکتا
میرے بارے میں بہت کم تو میاں! جانتا ہے

اپنی گمنامی ہی شاہد مجھے راس آئی یہاں
ورنہ شاعر کے حوالے سے زماں جانتا ہے

شاہد اشرف

غزل

نظیر اور کب ہے کہیں آسماں کی
سیاحت کرو ، مرمریں آسماں کی

وہاں نور پھیلا ہوا ہے خدا کا
نشانی ہے یہ بہتریں آسماں کی

زمیں تو مری اُنگلیوں پر کھڑی ہے
میں حد دیکھ پایا نہیں آسماں کی

تجھے ساتھ لے کر میں جاؤں وہاں تک
جہاں تک ہے وسعت زمیں آسماں کی

مری جیب میں ایک عرصے سے موجود
ہے تصویر اک دل نشیں آسماں کی

گھٹاؤں نے ہر سو دھواں سا بکھیرا
ہے رُت دیدنی سُرمگیں آسماں کی

وہاں اُس نے جاکر نہیں کچھ بتایا
جو خلقت ہوئی ہے مکیں آسماں کی

کسی روز وہ دن بھی آئے گا آخر
لبوں سے لگے گی جبیں ، آسماں کی

آفتاب خان

غزلیں

جستجو کو ہم جگا کر ہجر میں
تجھ کو ڈھونڈیں گے دیارِ فکر میں

جب زلیخا کی نظر ملتی نہیں
کیسے بکنے جاؤں میں اب مصر میں

جس کو آنکھوں نے کبھی دیکھا نہیں
عمر گزری ہے اُسی کے ذکر میں

پھول کھلنے کی دعا کرتے رہو
جھاڑیاں سی اُگ رہی ہیں فکر میں

محمد نوید مرزا

بات سے بات بنانے کا ہنر آتا ہے
مجھ کو آواز اُٹھانے کا ہنر آتا ہے

میں نے پلکوں سے تراشے ہیں خدوخال ترے
مجھ کو تصویر بنانے کا ہنر آتا ہے

بات کرتی ہیں درختوں سے نئے لہجے میں
شور چڑیوں کو مچانے کا ہنر آتا ہے

زندگی جس نے گزاری ہے یہاں کانٹوں پر
کیا اُسے پھول کھلانے کا ہنر آتا ہے

جس کی یادوں کی مہک ہے آس پاس
شعر کہتا ہوں اُسی کے ہجر میں

سب ہیں قاتل آدمیت کے نوید
فرق کیا ہے اب یزید و شمر میں

مسکراتے ہوئے آنکھوں میں نمی رکھتا ہوں
رونے والوں کو ہنسانے کا ہنر آتا ہے

بستیاں جس نے اُجاڑی ہیں سہولت سے بہت؟
کیا اُسے شہر بسانے کا ہنر آتا ہے؟

میرا کردار کہانی میں ضروری ہے نوید
ہر گھڑی مجھ کو نبھانے کا ہنر آتا ہے

غزل

عداوتوں سے محبت کشید کرتا ہوں
میں بے حسوں سے مروت کشید کرتا ہوں

جو زہر ہوتا ہے تریاق میرے زخموں کا
بدن سے حسبِ ضرورت کشید کرتا ہوں

مرے ہنر کی مجھے داد دیجیے صاحب
اُداسیوں سے مسرت کشید کرتا ہوں

گلہ یہ کرتی ہے مجھ سے نصیب کی دیوی
میں خواہشوں سے حقیقت کشید کرتا ہوں

زمانے والے جو الفاظ ترک کرتے ہیں
میں اُن سے شعر کی لذت کشید کرتا ہوں

تمھاری یاد کو تیشہ بنا کے جانِ وفا
ہجومِ رنج سے فرصت کشید کرتا ہوں

ستم کی راہ میں دیوار ہوں سدا شاہد
میں پتھروں سے نزاکت کشید کرتا ہوں

ہمایوں پرویز شاہد

غزلیں

دل کی راحت خرید لیتا میں
کچھ سہولت خرید لیتا میں

ایک سکہ نہیں تھا پاکٹ میں
ورنہ جنت خرید لیتا میں

بینک بیلنس نہ کوئی گاڑی تھی
کیسے شہرت خرید لیتا میں

دام لگتے جو میری سانسوں کے
اُس کی چاہت خرید لیتا میں

میں بھی ہوتا جو افسر و شاعر
قد و قامت خرید لیتا میں

بس میں ہوتا اگر مرے بیٹی
تیری قسمت خرید لیتا میں

بیچ دیتا میں دوریاں ارشد
اور قُربت خرید لیتا میں

ارشد محمود ارشد

کاش یہ غم کی رات سو جائے
اضطرابِ حیات سو جائے

ہاتھ رکھے اگر تُو سینے پر
درد کی کائنات سو جائے

خواب آنکھوں میں آ بھی سکتے ہیں
نیند گر میرے ساتھ سو جائے

کون سمجھے قلم کی مجبوری
چلتے چلتے ، دوات سو جائے

حال دل کس طرح بیاں ہو گا
ہونٹ کھولوں تو بات سو جائے

قید میں عمر بیت جاتی ہے
جس کی راہِ نجات سو جائے

جب خزاؤں کا وار ہو ارشد
شاخ در شاخ پات سو جائے

غزل

کبھی خود پر بھی فاش کر مجھ کو
اس طرح بھی تلاش کر مجھ کو

عزم و ہمت کی اک چٹان ہوں میں
پیار سے پاش پاش کر مجھ کو

دل کے مندر میں پوجنا مجھ کو
بُت بناؤ تراش کر مجھ کو

میں تو اک گم شدہ خزانہ ہوں
زندگی میں تلاش کر مجھ کو

کوئی تصویر بن ہی جائے گی
دیکھنا تم تراش کر مجھ کو

کہہ رہی ہے ہر ایک شے مجھ سے
خود میں بھی تو تلاش کر مجھ کو

آؤ ! جینے کا تم ہُنر بخشو
اپنے ڈھب سے تراش کر مجھ کو

پیار ہی تو معاش ہے میری
یوں نہ تو بے معاش کر مجھ کو

کیوں یہ کہتا ہے آئنہ مجھ سے
رومی! تو پاش پاش کر مجھ کو

رومانہ رومی

غزلیں

جہاں میں لوگ سب ہنسنے ہنسانے آئے ہیں
بس ایک ہم ہیں جو آنسو بہانے آئے ہیں
جو اپنے عشق کے قصّے سنانے آئے ہیں
یہ میرے یار مرا دل دُکھانے آئے ہیں
سنہرے خوابوں کی وادی سے چاند سے چہرے
ہماری آنکھوں سے نیندیں چرانے آئے ہیں
بہار رُت میں مہکتے ہیں دل کے زرد گلاب
خزاں کے دکھ میں وہ آنسو بہانے آئے ہیں
یہ آسمان پہ پھیلے ہُوئے سیہ بادل
کسی کی آنکھ کا کاجل چرانے آئے ہیں

ریاض ندیم نیازی

ایسا نہ ہو کہ خواب بھی اِس آگ میں جل جائیں
اِس نفرتوں کے شہر سے ہم دور نکل جائیں

بچے بھی میرے ساتھ دُعا مانگ رہے ہیں
اے کاش مرے شہر کے حالات بدل جائیں

ہم موم کے پُتلے ہیں، کڑی دھوپ ہے سر پر
ہے ماں کی دُعا ساتھ تو ہم کیسے پگھل جائیں

حسرت بھی ہے نظروں سے کھلونوں کو چھپا لے
یہ دیکھ کے بچوں کو کہیں خود نہ مچل جائیں

پُرانی دیکھی جو البم تو یہ ہُوا احساس
پلٹ کے پھر وہی گزرے زمانے آئے ہیں
کسی کے ساتھ وہ آئے ہیں میرے گھر ملنے
وہ میرا صبر کیا پھر آزمانے آئے ہیں
اُنھیں خبر تھی کہ لکھی ہے یہ اُنھی کے لیے
غزل وہ میری مجھی کو سنانے آئے ہیں
ہر ایک چیز حسیں لگتی ہے ریاض ندیم
محبتوں میں کچھ ایسے زمانے آئے ہیں

دل چاہتا ہے پھر سے کوئی بزمِ سخن ہو
پھر اُس کو سنانے کوئی ہم تازہ غزل جائیں

محنت کے بنا تو کبھی ممکن ہی نہیں ہے
غربت کے کسی روز یہ دن رات بدل جائیں

غزل

حسنین سحرؔ

گر کوئی آشنا نظر آ جائے
یوں ہو جیسے خدا نظر آ جائے

محرمِ مبتلا نظر آ جائے
خود سا اِک دوسرا نظر آ جائے

منکرِ ماسوا یہ بند آنکھیں
جانے دیکھیں تو کیا نظر آ جائے

میری کوتاہ بیں نگاہوں کو
کوئی چشمِ رسا نظر آ جائے

غور سے دیکھتا ہوں ہر ہر نقش
جانے کب مدعا نظر آ جائے

ڈر یہی ہے مری خطاؤں میں
کوئی تیری خطا نظر آ جائے

غصے پر قابو پایئے کہ سحرؔ
یوں نہ ہو التجا نظر آ جائے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اُبھری نہ کوئی شکل نہ پیکر نظر آیا
تصویر میں رنگوں کا سمندر نظر آیا

غزل

مری سوچوں پہ پابندی، میں آدھا سوچ سکتا ہوں
یہی قدغن زباں کرلوں! طریقہ سوچ سکتا ہوں

کوئی خواہش نہیں دِل میں، کہ سوچوں اچھا کیا ہے؟
مجھے جتنی اجازت ہے، میں اُتنا سوچ سکتا ہوں

ترا کہنا کہ سوچوں کو ذرا سا مختصر کردوں
کمی تو غیر ممکن ہے، اضافہ سوچ سکتا ہوں

میں اچھا کر نہیں پاؤں یہ ممکن بات ہے صاحب!!
مگر یہ میرے بس میں ہے، کہ اچھا سوچ سکتا ہوں

ابھی تک تو نہیں سوچا، مگر یہ عین ممکن ہے
تری تقلید میں اپنا، خسارہ سوچ سکتا ہوں

تجھے میری ضرورت ہے! فقط تیری ضرورت تک!!
ارے پاگل! تری بابت، میں ایسا سوچ سکتا ہوں؟

وہ ہجرت تھی یا بے دخلی عبث ہے سوچنا ایسا
مگر اس شہرِ بسمل کا میں نقشہ سوچ سکتا ہوں

اگر پوچھے کوئی مجھ سے، میں کن سوچوں میں رہتا ہوں
کوئی اچھا، مناسب سا بہانہ سوچ سکتا ہوں

مقید کرکے رکھی ہے زباں دانتوں کے پہرے میں
یہاں سچ کہنا مشکل ہے، نتیجہ سوچ سکتا ہوں

خدا نے سوچ رکھی ہے، مری سوچوں کی حد بندی
اُسے بس دیکھنا ہے یہ، میں کتنا سوچ سکتا ہوں

تجھے یہ واہمہ کیوں ہے کہ میں سوچوں سے عاری ہوں
اگر چاہوں تو میں تجھ سے زیادہ سوچ سکتا ہوں

بڑی حیرت ہوئی مجھ کو، یہ تم نے کس طرح سوچا؟
تمہارے ساتھ چلنے کا دوبارہ سوچ سکتا ہوں

حدِ فاصل مقرر ہے کہ مت سوچو میں کب سے ہوں
اُسے معلوم تھا میں بھی یہ نکتہ سوچ سکتا ہوں

مجھے سوچوں کی وسعت سے کوئی مطلب نہیں دانش
بڑی دِل کو تسلی ہے میں جتنا سوچ سکتا ہوں

دانش عزیز

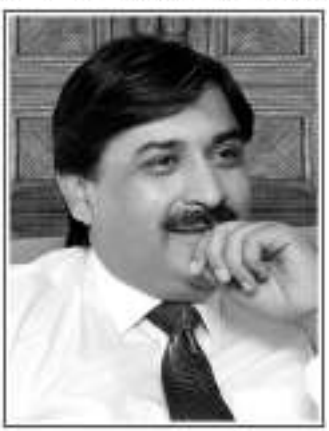

غزل

اَپنے سِوا جو ہر کوئی اَچھا دِکھائی دے
جنت کا اِس زمین پہ نقشہ دِکھائی دے

بادل میں کھیلتا ہوا بچہ دِکھائی دے
مجھ کو ابھی بھی چاند میں چرخہ دِکھائی دے

بکھرے گا کرچیوں میں جو سَر پر مرے لگا
پتھر بھی آج کل مجھے شیشہ دِکھائی دے

میرا اَب آئنے پہ بھروسہ نہیں رہا
مجھ سے مِلانا اُس کو جو مُجھ سا دِکھائی دے

میرے بَدن میں لگتا ہے شمشان گھاٹ ہے
ہر رات کوئی خواب میں جلتا دِکھائی دے

چل اُس سے پوچھتے ہیں جو آیا اُدھر سے ہے
مجھ کو یہ آسمان کیوں اُلٹا دِکھائی دے

ڈَر ڈَر کے آرہی ہیں یہ ہچکی کے ساتھ ساتھ
سانسوں پہ اِک عجیب سا پہرہ دِکھائی دے

بینائی میں خَلَل ہے یا میرے دماغ میں
مجھ کو ہر اِیک شخص ہی اَندھا دِکھائی دے

دانش مِرے یقین کو تشکیک کھا گئی
مجھ کو دُعا کی عَین پہ نقطہ دِکھائی دے

دانش عزیز

غزل

تلخ ہوتی گئی حیات مری
کوئی سنتا نہیں تھا بات مری

اب ہو کیا ذکر گریہ زاری کا
کٹ گئی جیسے تیسے رات مری

جیت یوں بھی مجھے پسند نہیں
اچھی لگتی ہے اُس کو مات مری

اک یقین و گمان کے اندر
بس معلق رہی ہے ذات مری

محفلیں ہیں جہاں محبت کی
حاصلِ ذکر ذات پات مری

عشق، دریا ہے آگ کا شاہد
میں کہاں اور کیا بساط مری

شاہد فرید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ لوگ مول چکائیں گے میرے بعد ترا
یہ خانہ زاد، مرے بھائیوں کے ساتھی ہیں

غزل

خبر یہ جابجا پھیلی ہوئی ہے
کہ بستی میں وبا پھیلی ہوئی ہے

ردائے نور بن کر میرے سر پر
مری ماں کی دُعا پھیلی ہوئی ہے

فلک پر چاند تارے ضوفگن ہیں
اندھیرے میں ضیا پھیلی ہوئی ہے

یہ قبریں ہیں کہ بڑھتی جا رہی ہیں
عجب رسمِ فنا پھیلی ہوئی ہے

مریض و چارہ گر ، نادان سارے
دوا بن کر قضا پھیلی ہوئی ہے

نمازیں دم بہ خود ، خانہ بہ خانہ
اذانوں کی نوا پھیلی ہوئی ہے

کرم کر صدقۂ محبوبؐ ، مولا
ترے در پر دعا پھیلی ہوئی ہے

بچھونا اوڑھنا فیضانؔ ڈر خوف
کرونا کی بلا پھیلی ہوئی ہے

فیض رسول فیضان

غزلیں

ہوش میں تو مجھے دو چار نظر آتے ہیں
اور جو باقی ہیں بیمار نظر آتے ہیں

نیکی کرنے کی بھی ملتی نہیں اِن کو فرصت
لوگ اَیسے مجھے بیکار نظر آتے ہیں

مجھ کو لگتا ہے، وہ پتھر کا بنا ہے شاید
بُت اُسے صاحبِ دستار نظر آتے ہیں

خواب میں تنگ اُنھیں کرتا ہے شاید کوئی
نیند میں لوگ جو بیدار نظر آتے ہیں

اچھا کیا ہے، بُرا کیا ہے، نہیں جس کو معلوم
اُس کو تو درہم و دینار نظر آتے ہیں

کوئی جانباز یہاں دیکھا نہیں ہے فاروقؔ
سب تماشے پسِ دیوار نظر آتے ہیں

زبیر فاروق

ختم سب کار ہونے والا ہے
جینا دشوار ہونے والا ہے

کس لیے بے قرار ہے یہ دل
کس کا دیدار ہونے والا ہے

ساتھ تیرے جو تھا ہوا پہلے
وہی اِس بار ہونے والا ہے

خطرہ ہے اور بہت ہی خطرہ ہے
کوئی بیمار ہونے والا ہے

ہونے والی ہے اک کرامت پھر
یار اُس پار ہونے والا ہے

مل کے پھر تو نبھائیں گے ہم تم
کوئی بے کار ہونے والا ہے

ڈرتا ہوں کھیل کچھ نیا فاروقؔ
پسِ دیوار ہونے والا ہے

غزل

فاصلہ درمیاں بڑھاتے ہوئے
رو رہا تھا وہ مسکراتے ہوئے

ہم کسی اور سمت کیوں دیکھیں
آپ کو آئنہ دکھاتے ہوئے

کیوں اُداسی اُترنے لگتی ہے؟
میرؔ کا شعر گنگناتے ہوئے

ایک نقطے پہ مل گئے دونوں
ہجر کا دائرہ بناتے ہوئے

اب یہی فکر ہم کو لاحق ہے
کیسے دیکھیں گے اُس کو جاتے ہوئے

ہم کنارے سے آ لگے عاصمؔ
خود کو اِک لہر سے بچاتے ہوئے

عاصم اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے ماحیِ غمِ دل و دنیا! ترے لیے
محوِ دعا رہے رُسلِ ذوالمنن تمام

غزلیں

بدلتے حسن کے جلووں کا اعتبار نہیں
مجھے بہار کے رنگوں کا اعتبار نہیں
ضروری ہے کہ رویوں پہ بات کی جائے
کسی بھی طرح دلیلوں کا اعتبار نہیں
سراب پانی کسی کو دکھائی دیتا ہے
کسی کو پھوٹتے چشموں کا اعتبار نہیں
بھڑک بھی سکتی ہے جسموں کے خرمنوں میں آگ
برستی بھیگتی شاموں کا اعتبار نہیں
سرشت خاک بشر کی اسے پسند آئے
جسے وفا کے نصابوں کا اعتبار نہیں

بتا رہا تھا اسے وقت نے جھنجھوڑا ہے
بتا رہا تھا کہ خوابوں کا اعتبار نہیں
میں آج بھی انہی چشموں کا پانی پیتا ہوں
یہ کیوں کہوں مجھے وعدوں کا اعتبار نہیں
مجھے ارادوں پہ اپنے بہت بھروسہ ہے
ذرا بھی ڈوبتی سانسوں کا اعتبار نہیں
تعلقات پہ کیا اوس پڑ گئی جاذبؔ
کہاں کے لفظ کہ اشکوں کا اعتبار نہیں

اکرم جاذب

اک بھیگی شام دو گھڑی آئے تھے دام میں
اس کو بدل دیا گیا قیدِ دوام میں

دھڑکن کی لے پہ ساز سے بجتے چلے گئے
ساتوں سروں کا حسن تھا اس کے کلام میں

پرواز ہے یہ طائرِ دل کی فلک کے پار
کہتے ہیں جس کو پیار سبھی عرفِ عام میں

کانٹوں سے دشمنی تھی اگر، رکھتے عمر بھر
پھولوں کو کیوں مسل دیا اس انتقام میں

پینے میں جاذبؔ اب یہ تامل گناہ ہے
وہ زہر جب ملا ہی چکا میرے جام میں

غزلیں

یوں تو اپنی فطرت میں ہے یاروں سے دلداری بھی
تھوڑا تھوڑا سیکھ رہی ہوں دنیا سے عیاری بھی

لگتا ہے معصوم وہ کتنا اس پہ صورت پیاری بھی
ہنستے ہنستے ضرب لگائی دل پہ اس نے کاری بھی

پہلے جی بھر طنز اچھالو، تیر چلاؤ نفرت کے
فرصت ہو تو کر لینا پھر تھوڑی سی غمخواری بھی

دل کی خیر منائیں کیسے، خود پہ قابو پاؤں کیا!
اک تو روپ سجیلا اس کا اس پہ نین کٹاری بھی

کہہ دو دنیا والوں سے یہ عشق ہے کوئی کھیل نہیں
دل پہ داؤ لگا رکھا تھا، جان کی بازی ہاری بھی

اک مدت سے دل کی بستی سوگ مناتی ہے کس کا
دن کا کٹنا ہی مشکل تھا، اس پہ رین ہے بھاری بھی

عیب ہزاروں مجھ میں بھی ہیں لاج کسی نے رکھ لی ہے
راز چھپا رکھا ہے اس نے، کی ہے پردہ داری بھی

عشرتؔ جی یہ سخنوری ہے، اتنی بھی آسان نہیں
الفاظوں میں رنگ بھرو کچھ، سیکھو پھر فنکاری بھی

جیسے فنا کے تار جڑے زندگی کے ساتھ
سجدہ بتوں کو پیش کیا بندگی کے ساتھ

اک برق سی گرا کے دلِ سوختہ پہ آج
وہ پوچھتا ہے حال مرا سادگی کے ساتھ

شاید کہ اس گلی سے گزر اس کا ہو کبھی
دل منتظر ہے آج بھی دیوانگی کے ساتھ

آساں نہیں کہ جیت لے وہ ہر محاذ کو
سو جنگ سی چھڑی ہے ہر اک آدمی کے ساتھ

وعدے پہ اس کے جان بڑھ کر یقین تھا
میں راہ اس کی تکتی رہی بے خودی کے ساتھ

شبانہ عشرت

غزل

پہلی ہی بار ہو گیا میں مبتلائے عشق
دل میں جو آئے تو کبھی دل سے نہ جائے عشق

نکلا حصارِ ذات سے مَیں ایک جست میں
بے شک مجھے گلی گلی اب تو پھرائے عشق

دریا تو اپنے زور سے مجھ کو ڈبو چکا
لہروں کے ساتھ ساتھ مجھے اب بہائے عشق

ہوش وخرد ، قرار وسکوں میرا لٹ چکا
سب کچھ تو میرا چھین چکی ہے بلائے عشق

جو قافلے ہیں درد کے وہ جائیں گے کہاں
کیا جانے کس دیار میں ہو گی سرائے عشق

اپنے جگر کے خون سے سینچے ذرا کوئی
میری طرح سے کوئی تو دل میں اگائے عشق

نکلا تھا میں تلاش میں جبرانؔ حسن کی
مجھ کو ملا جو عشق ، ہُوا آشنائے عشق

وسیم جبران

غزل

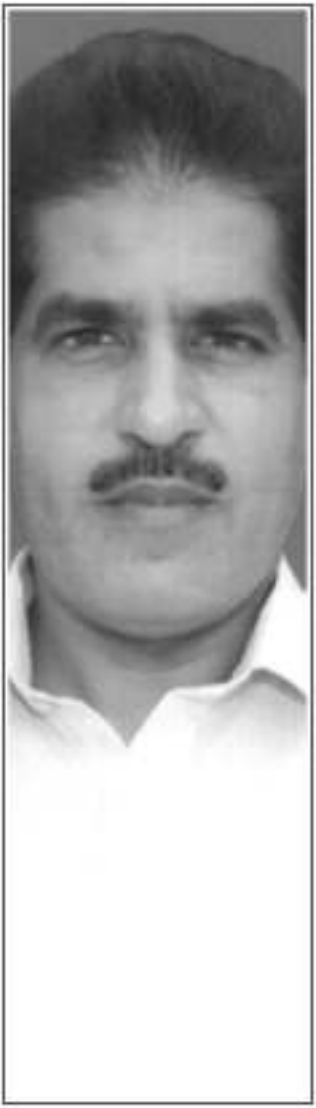

جگہ جب تنگ سی پڑنے لگی دشتِ زمیں پر
اُگا ڈالے شجر پھر اُس نے ہرنوں کی جبیں پر

ستم دیکھو! نہیں ہوتی قبول اب تو دعا بھی
کبھی میں لائقِ سجدہ بھی تھا عرشِ بریں پر

تعلق ختم کرکے روبرو آنے لگے پھر
ستم پہلے ہی کیا کم ہیں مری جانِ حزیں پر

فرشتہ تو نہیں جو روک لوں اپنے قدم میں
چلوں گا ساتھ منزل تک جلیں چاہے بجیں پر

ہے مہنگائی نے یوں گھیرا ہوا چاروں طرف سے
گزارا کر رہا ہے ہر کوئی نانِ جویں پر

جلا ملتی رہے پرواز کے جذبوں کو ہر دم
سجا رکھے ہیں کمرے میں پرندوں کے حسیں پر

زمانہ ہو چکا دیکھے ہوئے اک دوسرے کو
ہیں دونوں ہی مکیں بھی ایک چھوٹی سی زمیں پر

ترا مقصد تھا گر اے زندگی! تکمیلِ فرحانؔ
تو کیوں چل دی ادھورا چھوڑ کر فرشِ زمیں پر

سرور فرحان

غزل

مہرباں وقت ہے اور کھلا آسماں، چاندنی رات ہے دلرُبا بات کر
وقت کے راگ سے پھر وہی گیت بُن، دل کی ہر تال پر گنگنا بات کر

تیرے ماتھے پہ پڑتی شکن دیکھ کر وصل کی یہ گھڑی بھی نکل جائے گی
بھٹکتی شب منانے میں ڈھل جائے گی ایسے عالم میں کیوں ہے خفا بات کر

عشق میں ہو گیا ہے ترے مبتلا اپنا دامن مرے دل سے یوں مت چھڑا
دل کی آواز سُن کہہ رہا ہے یہ کیا، آ مرے پاس آ بیٹھ جا بات کر

اپنی پازیب کے سُر ملا ساز سے چھیڑ دے پھر وہی نغمۂ دلکشی
پھر سے دو آتشہ ہو مزا جام کا چشمِ مخمور کو بھر ذرا بات کر

مرمریں ہاتھ لیکر ترا ہاتھ میں دیکھ جلنے لگا ہے بدن ساتھ میں
تھرتھرانے لگے لب ترے کس لیے، دیکھ مہکی ہے ساری فضا بات کر

عاطف جاوید عاطف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بے حس کسی خنکی سے پگھلتے نہیں خالد
اے ماں! ترے بیٹے ترے اشکوں پہ کھڑے ہیں

غزلیں

یوں میری خامیوں سے حسد کر رہے ہو کیوں
تم ایسے اختلاف کی حد کر رہے ہو کیوں

لگتا ہے ڈھونڈتے ہو جنوں کا جواز تم
یوں امتیازِ عشق و خرد کر رہے ہو کیوں

سوچو اگر تو اس میں بھلا ہے تمہارا بھی
بے وجہ مری بات کو رد کر رہے ہو کیوں

پڑتا ہو جن سے ماند نگارِ غزل کا حسن
ایسی روایتوں کو سند کر رہے ہو کیوں

عدنان خالد

یوں اس نے اپنی چاہ کا محور بدل دیا
جیسے مرا مقام ہی یکسر بدل دیا

اس نے کہا کہ تم سے محبت ہے آج بھی
اور اس کے بعد فون کا نمبر بدل دیا

تم پر نجانے ہجر کا کتنا ہوا اثر
میرے لیے تو تم نے کلنڈر بدل دیا

ہونے سے اس کے تھی مرے چہرے پہ تازگی
پھر اس نے میرا رنگ بچھڑ کر بدل دیا

جو باغبان ہے ہی نہیں اس کی نذر تم
گلہائے تازہ تر کی سبد کر رہے ہو کیوں

یہ سب تو ہیں تمہارے مقدر کی راحتیں
تم میرے نام اپنی رسد کر رہے ہو کیوں

ربِ ہنر سے جاؤ کرو تم شکایتیں
عدنان سے تم اتنا حسد کر رہے ہو کیوں

جس روز وہ ملا تھا بدل سا گیا تھا میں
اور جا کے اس نے مجھ کو مکرر بدل دیا

عدنان کچھ نہ مجھ میں بچا یعنی وقت نے
باہر بدل دیا مرا اندر بدل دیا

غزل

بندھی ہوئی ہے پلکوں سے اک رات، قیامت والی رات
مرگِ محبت، رخصت اور بے سمت مسافت والی رات

صبح سے پہلے راکھ بنی اور دیئے کی لَو میں جذب ہوئی
کشف و کرامت، قسمت، حیرت اور حکایت والی رات

ریشہ ریشہ اتر رہے تھے ریشم ریشم جیسے خواب
قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی وصل کی ساعت والی رات

رکی ہوئی ہے اک مدّت سے، ہم جیسے بے خوابوں میں
نیندوں، خوابوں، آنکھوں سے اور خود سے بغاوت والی رات

تارے توڑو، چاند اتارو، خوابوں کو تسخیر کرو
جانے پھر کب ہاتھ لگے گی ایسی فرصت والی رات

سب سے مقدّس، سب سے حسین اور سب سے زیادہ روشن
بیعت، ہجرت، نسبت اور نورِ عقیدت والی رات

سبز دنوں کے زردی مائل چہرے پر بے چینی تھی
مجھ بے رنگ میں جب اتری تھی نیلی رنگت والی رات

یعنی اب تک محوِ سفر ہے زندانی آنکھوں میں نبیل
ہر بندش سے دور پرے اک پوری اجازت والی رات

عزیز نبیل

غزل

ایک ہی بات دِگر بار بھی ہو سکتی ہے
دوسری بار مری ہار بھی ہو سکتی ہے

آخری بات پہ اصرار کیے جاتے ہو
آخری بات سرِ دار بھی ہو سکتی ہے

عشق چپ چاپ کسی دشت میں کھو سکتا ہے
عاشقی تیری طلبگار بھی ہو سکتی ہے

جس نے خاموش نگاہوں سے گزارش کی ہے
وہ تری راہ کی دیوار بھی ہو سکتی ہے

اس کے ہنسنے پہ شرارت کا گماں ہوتا ہے
جیسے ہنستی ہے اداکار بھی ہو سکتی ہے

دل کسی اور کو چاہے گا تو کافر ہو گا
آنکھ ہے ! آنکھ گنہگار بھی ہو سکتی ہے

گندمی رنگ سے اٹھتی ہوئی سوندھی خوشبو
یہ ترے جسم کے اس پار بھی ہو سکتی ہے

افتخار شاہد

غزلیں

مجھ کو جو شے پسند آئی تھی
آگ تھی، آگ بھی پرائی تھی

جب بغاوت ہوئی تھی زنداں میں
عین اسی دن مری رہائی تھی

اس پہ ابلاغ خامشی نہ ہوا
میں نے ہر بات اسے بتائی تھی

بانٹ دی ہے وہ آگ لوگوں میں
دیوتاؤں سے جو چرائی تھی

کتنی مشکل سے اپنے خوابوں میں
میں نے اپنی جگہ بنائی تھی

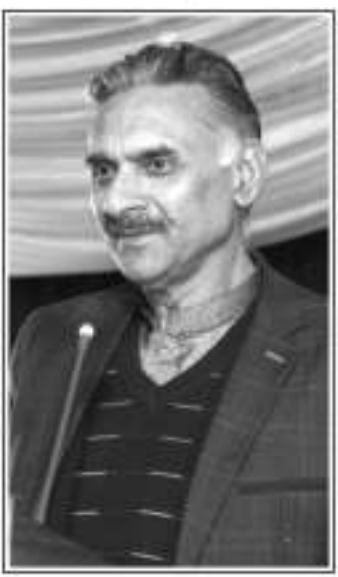

احمد حسین مجاہد

خوشبو کی طرح گزر گیا ہے
وہ سب سے ہاتھ کر گیا ہے

ڈرتے نہیں لوگ بد دعا سے
تو میری دعا سے ڈر گیا ہے

شانوں سے یہ دھوپ بھی اتاروں
سینے سے تو بوجھ اتر گیا ہے

وہ حال ہوا ہے ظالموں کا
مظلوم خدا سے ڈر گیا ہے

لے سانس کبھی تو سکھ کا احمد
ظالم تو بہت بکھر گیا ہے

غزلیں

یہ جو الہام کا سیارہ ہے
یہ بڑے کام کا سیارہ ہے

دل مری بات کا بھروسہ کر
عشق آلام کا سیارہ ہے

خطۂ درد سے گزرتا ہوا
میرے انجام کا سیارہ ہے

یہ جو میری نگاہ پہ ابھرا
یہ ترے نام کا سیارہ ہے

پیشِ افلاک کا سفر ہے مجھے
تو رہِ عام کا سیارہ ہے

کرب کی محوری مسافت میں
معتبر جام کا سیارہ ہے

ہر گھڑی ورد ہو دعائے قنوت
زندگی شام کا سیارہ ہے

بے گناہی کے بام پہ عادل
نئے الزام کا سیارہ ہے

عزیز عادل

کملا گئی رگوں کو مسلسل سفر کی بھوک
پیروں کے آبلوں کو لگی در بہ در کی بھوک

سر میں سمائے اب نہ کسی جستجو کی فکر
زیرِ قدم رہے نہ کسی رہ گزر کی بھوک

رہتا ہے یاد کب کسی روشن نظر کا ضبط
جب دھیان نوچ لیتی ہے اک چشمِ تر کی بھوک

ساکت کھڑے ہیں سانس کی ڈوری کسے ہوئے
آئے جسے مٹانا ہے مشقِ ہنر کی بھوک

ساتوں فلک کی بات الگ ہے خلا نشین!
اک آسمان سے نہ مٹے بحر و بر کی بھوک

عادل دعا بدست ہے ابرِ کرم کھلے
پیڑوں کو ہے لگی ہوئی برگ و ثمر کی بھوک

غزل

تنہا بھٹکتی رُوحوں کی یکساں مَعاش ہے
تم کو ہماری ، ہم کو تمھاری تلاش ہے

میرا تمھارا رات کے باغوں میں گھومنا
اک راز ہے جو صرف اندھیرے پہ فاش ہے

'دُنیا شکستہ ''آئینہ دیوار'' ہی نہ ہو
ٹکرا کے جس سے عکس مرا پاش پاش ہے

یہ لوگ زومبی فلم کے کردار ہی نہ ہوں
ہر شخص چلتی پھرتی ہوئی زندہ لاش ہے

انسان ہی تو سب سے بڑا ہے خدا پرست
انسان ہی تو سب سے بڑا بُت تراش ہے

سب سے زیادہ دیکھی گئی چیز ''خواب'' ہیں
سب سے زیادہ بولا گیا لفظ ''کاش'' ہے

مہتاب کی کشش اِسے طوفاں بنائے گی
مجھ میں جو لہریں کھاتا ہوا ارتعاش ہے

شاہد ماکلی

غزل

پوچھتے تم ہو، کیا محبت ہے
ایک روشن دیا محبت ہے

نفرتوں کا سبب انائیں ہیں
عاجزی کا صلہ محبت ہے

ہم نے سیکھا ہے اپنے پرکھوں سے
زندگی کی بقا محبت ہے

جو بھی سمجھو تمھاری مرضی ہے
در حقیقت خدا محبت ہے

سب کی چاہت کمال ہوگی مگر
ماں کی سب سے جدا محبت ہے

دشتِ نفرت میں ہر گھڑی فرخ
میرے لب پر ندا محبت ہے

سید فرخ رضا ترمذی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شہرِ عمل میں بھاگتے لمحوں کے ساتھ بھاگ
خالد حصارِ فکر سے باہر نکل کے آ

غزل

مرزا اسکندر بیگ

یہ زمیں آفات سے دوچار ہے
زندگی صدمات سے دوچار ہے

آنکھ بھر لائی سمندر شہر میں
ہر گلی برسات سے دوچار ہے

بجھ گئے کتنے ستارے رات کو
روشنی خطرات سے دوچار ہے

ہو گیا اوجھل کہیں افلاک بھی
ہر قدم خدشات سے دو چار ہے

چھو لیا گر آسماں تو کیا ہوا
خلق تو ظلمات سے دوچار ہے

بر لبِ دریا سفر میں قافلہ
پیاس کی بہتات سے دوچار ہے

دشت میں دم توڑتی خلقِ خدا
بے یقیں حالات سے دوچار ہے

جیت جاتے ہیں سگِ آوارگاں
آدمی تو مات سے دوچار ہے

دوستوں کی اب سکندر دوستی
درد کی سوغات سے دوچار ہے

غزل

ہوش میں آ کے گرا ہوں
دھوکا تھا جس پہ مرا ہوں

دیکھ کر مزدور بچہ
زندگی سے میں ڈرا ہوں

بیچ مت واعظ خدا کو
باخدا بندہ کھرا ہوں

بے عمل ہوں میں نمازی
اور سجدے کر رہا ہوں

کچھ تو مہلت، وحشیو! دو
بچوں کا میں آسرا ہوں

خوش رہو محسن کہوں کیا
میں مقدر کا ہرا ہوں

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون دیوان خالد پڑھے گا یہاں
ہم نوا کیا ، کہ اب ہم زباں بھی نہیں

غزل

حبس ہے مجھ میں سوا، آج ہوا آئی نہیں
روز آتی تھی ہوا، آج ہوا آئی نہیں

دو دیے جلتے رہے، جلتے رہے اور آخر
اک نے دوجے سے کہا، آج ہوا آئی نہیں

میں نے کل خواب میں دیکھا تھا اسے آتے ہوئے
یہی تعبیر ہے کیا، آج ہوا آئی نہیں

اک ہوا اور بھی آتی ہے یہاں شام کے بعد
آج اسے علم ہوا، آج ہوا آئی نہیں

ایک بس میرے محلے کا ہی مذکور ہے کیا
جانے کتنی ہی جگہ، آج ہوا آئی نہیں

دیدنی ہے سبھی پیڑوں کی اُداسی غائر
کوئی پوچھے تو ذرا، آج ہوا آئی نہیں

کاشف حسین غائر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مری بات کہتے رہنا ، یہ قلم اُٹھائے رکھنا
یہ علَم فرو نہ کرنا ، یہ فلک سجائے رکھنا

غزل

زمانے کا یہ رویہ سمجھ نہیں آیا
کسی کو جیسا ہوں ویسا سمجھ نہیں آیا

میں کیسے مان لوں منصف کی منصفی کہ اسے
پھٹا ہُوا مرا کرتہ سمجھ نہیں آیا

تغیر ایک حقیقت سہی مگر تیرا
یہ اتنا جلدی بدلنا سمجھ نہیں آیا

وہ دیکھ سکتا ہے: میرا یقیں غلط نکلا
اسے خموشی کا لہجہ سمجھ نہیں آیا

خدا کی مانی نہیں، اُس کے ماننے والو!
مجھے تمہارا عقیدہ سمجھ نہیں آیا

سمجھ سکا ہے اگر کوئی تو بتائے مجھے
صغیر ہونا نہ ہونا سمجھ نہیں آیا

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جلدی نہ کر، نظر سے اتر، دیکھ بھال کر،
کہسار کے فراز کے نیچے سنبھل کے آ

غزل

غزل تمام ہوئی ہے تو اب سُنانی ہے
اُسی غزال کو جس کی یہ مہربانی ہے

وہ اس کے کام نہیں ہیں جو اس سے لیتا ہوں
دھڑک رہا ہے اگر دل تو مہربانی ہے

سبھی کو بات مری آ گئی پسند بہت
کچھ اس لیے بھی کہ سب کی یہی کہانی ہے

ہمیں نہ اپنی محبت میں کوئی قید کرے
ہمارے پاس قبیلے کی پاسبانی ہے

سکوں نصیب ہوا شہر سے نکلتے ہی
مکاں سے خوب تو اے دوست! لا مکانی ہے

بے آب دشت میں رہتے ہیں کچھ خدا والے
کہ جن کی آس فقط آسماں کا پانی ہے

یہاں کے لوگ تو بس خامشی سے دبتے ہیں
مری زبان سے اچھی تو بے زبانی ہے

گنہ، ثواب ہوئے ہیں ہماری نظروں میں
یہ بات بھی تو قیامت کی اک نشانی ہے

فخر عباس

غزل

ہاتھ ایسا دکھا دیا مجھ کو
میرے قد سے گھٹا دیا مجھ کو

پہلے مجھ کو بٹھا لیا سر پر
پھر اچانک گرا دیا مجھ کو

ہائے! کتنا حسین سپنا تھا
ہائے! کس نے جگا دیا مجھ کو

روتی آنکھوں سے مسکرا دینا
اِس ادا نے رُلا دیا مجھ کو

مت کرو تم وفا! وفا! صاحب
اِس وفا نے ہے کیا دیا مجھ کو

ایک شیطان تھا ترا باغی
تو نے اُس سے بھڑا دیا مجھ کو

خاک ہی سے بنایا تھا تو نے
خاک ہی میں مِلا دیا مجھ کو

تیری دنیا کی دلکشی، توبہ!
کام اپنا بھلا دیا مجھ کو

دین و دنیا کا کیا تماشا ہے
گُنجلک نے گھما دیا مجھ کو

اُس نبیؐ پر درود ہوں لاکھوں
جس نبیؐ نے خدا دیا مجھ کو

اِک تبسم نے کی مسیحائی
مر رہا تھا، جِلا دیا مجھ کو

اے زمانے! تری عنایت ہے
اشک پینا سکھا دیا مجھ کو

اُٹھ کے لکھتا ضیاؔ ہوں راتوں کو
شاعری نے کھپا دیا مجھ کو

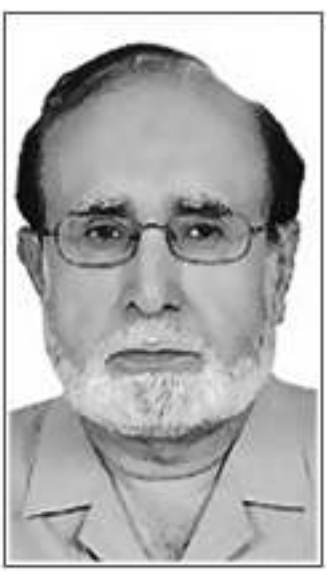

سید ضیا حسین

غزلیں

اب جو بچھڑے ہیں تو ملنے کا گماں باقی ہے
جیسے مٹ جانے کے بعد اگلا جہاں باقی ہے

خواہشیں مرتی نہیں شکل بدل لیتی ہیں
جل بجھا شعلۂ جاں کب کا، دھواں باقی ہے

کس کی منزل تھی کہاں، کس کو کہاں رکنا تھا
دید وا دید گئی، عمرِ رواں باقی ہے

کتنے ساون مری آنکھوں میں اتر آتے ہیں
سوچتا رہتا ہوں کیا اور کہاں باقی ہے

کتنے تاریک گھروندے ہیں مگر سوچو تو
ایک اک ذرہ چمک سکتا ہے، جاں باقی ہے

ہم وہ خوش فہم کہ پھر ملنے کی امید لیے
سوچتے رہتے ہیں بس ایک ہی "ہاں" باقی ہے

بشیر احمد حبیب

آنکھ تو ہے بینائی نہیں ہے
مَن بھیتر تنہائی نہیں ہے

تیری باتیں کیسے جانوں
تجھ تک مری رسائی نہیں ہے

تیری آنکھوں میں جو دیکھی
دریا میں گہرائی نہیں ہے

دنیا داری کے جھگڑوں میں
کوئی کسی کا بھائی نہیں ہے

اُلفت کی اس راہ گزر میں
شہرت ہے، رسوائی نہیں ہے

دیکھ حبیب اب دنیا بھر میں
دل ایسا سودائی نہیں ہے

غزل

صحرا میں قافلے کے نشاں ڈھونڈتا رہا
بچھڑے تھے کس جگہ میں کہاں ڈھونڈتا رہا

دشمن نے کند تیر سے بدحال کر دیا
اور میں کہ تیز دھار سناں ڈھونڈتا رہا

احساس، بندگی کا اُسے دیر سے ہوا
غافل، سکون بیشِ بُتاں ڈھونڈتا رہا

تسخیرِ کائنات کے جذبے سے لیس تھا
پیری میں بھی وہ تاب و تواں ڈھونڈتا رہا

حیدر جو با وفا تھے وہ سولی پہ چڑھ گئے
میں عشق میں بھی سود و زیاں ڈھونڈتا رہا

حمید حیدر اعوان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی کی دلدلوں میں زندگی دھنس جائے گی
شہر مٹی کے سمندر میں اسارے جائیں گے

غزل

ایسی بھی کیا بے یقینی آ گئی
وسوسے اور پیش بینی آ گئی

دیکھتے ہو کِس لیے زیر و زبر
کیا تمھیں بھی نکتہ چینی آ گئی

تیرے میرے درمیاں دنیا نہ ہو
کیا کروں؟ آخر کمینی آ گئی

اِس لیے آیا تھا کیا دنیا میں! مَیں
مجھ پہ ہر آفت زمینی آ گئی

کھا چکا ہوں نت نئے دھوکے یہاں
اِس لیے باریک بینی آ گئی

سازشیں ہونے لگی ہیں تیز تر
ساعتِ گدی نشینی آ گئی

مِل گیا تھا مجھ کو اِک دن آئنہ
راس پھر خلوت نشینی آ گئی

کِس لیے کرتا رفوگر کو تلاش
اب قبا مجھ کو بھی سینی آ گئی

اُن کے آنے کا سُنا شہزاد جب
ایک خوشبو بھینی بھینی آ گئی

شہزاد احمد شیخ

غزل

خدا کو مان غضب سے نہ یوں پکار مجھے
کرے گا سیلِ رواں پھر سے اشک بار مجھے

میں اپنی آنکھ سے اوجھل رہا ہوں دیر تلک
غموں کی دھول نے ایسا کیا غبار مجھے

میں خود شناس جو ہوتا اگر خدا کی قسم
مرا خلوص رُلاتا نہ بار بار مجھے

رہا ہوں ذات کے بحرِ عمیق میں کل تک
کیا ہے تیری محبت نے آشکار مجھے

فراق دل میں محبت جلائے رکھتا ہے
اب ایک پل بھی میسر نہیں قرار مجھے

مرا غنیم مجھے بے ثبات کر نہ سکا
کیا ہے تیرے تغافل نے بے قرار مجھے

رہے جو گردشِ دوراں میں عابدی مرے ساتھ
تمام عُمر رہا اُس کا انتظار مجھے

علی حسین عابدی

غزل

جہاں زمانہ گروں سے کلام بنتا ہے
مری زباں کا وہاں اختتام بنتا ہے

سجیل خواب و مناظر کے ست ملانے سے
نمیدہ آنکھ کے نم کا نظام بنتا ہے

ترے فقیر سمجھتے ہیں کسرِ شان انھیں
وہ کام جن سے کروڑوں کا دام بنتا ہے

یہ شہر دشت کے نقشے پہ ہے اسارا گیا
یہاں پہ میرا کئی دن قیام بنتا ہے

مداریوں کے تعارف میں اتنا کہتا چلوں
بغیر کام دکھائے بھی نام بنتا ہے

عزیز فیصل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

روپ کو دھن جانا تو من میں لوبھ گھنیرا پھیل گیا
دریا دریا ، صحرا صحرا ، دامن میرا پھیل گیا

غزلیں

کون سمجھے گا زمانے میں یہ تاثیر کا دکھ
کھا گیا دل کو مرے خواب کی تعبیر کا دکھ

روز تنہائی میں دکھڑے یہ سناتی ہے مجھے
میں نے سینے سے لگا رکھا ہے تصویر کا دکھ

دل ترے ہجر کے زندان سے نکلا بھی نہیں
جسم کو کھائے چلا جاتا ہے زنجیر کا دکھ

یہ لکیریں سی جو بکھری ہیں مرے ماتھے پر
اپنی پیشانی پہ لکھ رکھا ہے تقدیر کا دکھ

کس طرح اس کو سمیٹوں میں شکستہ دل میں
ٹوٹتے بنتے ہوئے غم تری تفسیر کا دکھ

روح کو چھلنی سا کرتے ہیں رویے صاحب
اور دکھ سب سے بڑا ہوتا ہے تحقیر کا دکھ

مر گئی شہر میں رانجھے کو صدائیں دیتی
شہر میں کوئی سمجھ پایا نہیں ہیر کا دکھ

تاثیر جعفری

جو کر کے رفو پیرہن ناچتے ہیں
چھپانے کو دردِ کہن ناچتے ہیں

ذرا بھی نہیں فکر سود و زیاں کی
سرِ دار کیا بانکپن ناچتے ہیں

ہوا تذکرہ جو ترے گیسوؤں کا
مرے ساتھ اہلِ سخن ناچتے ہیں

ترے نرم ہونٹوں کی حدت میں شافی
شگفتہ شگفتہ سمن ناچتے ہیں

محسن رضا شافی

غزل

اب مجھے بھول، کوئی بات نہ کر، جانے دے
بیتے لمحوں کے مناظر کو بکھر جانے دے

رات گہری ہے یہاں تو بھی ہے، سناٹا بھی
ہم چراغوں کو اندھیروں میں اتر جانے دے

میں نے کچھ کام ضروری ابھی نمٹانے ہیں
تیرا احسان، مرے یار! اگر جانے دے

میں اگر لوٹ بھی آیا تو مجھے مت ملنا
اس خرابی کو، مری جان! سدھر جانے دے

تیز بارش ہے کہ سڑکوں پہ بھی پانی ہے بہت
آج کی رات مجھے پاس ٹھہر جانے دے

تو نے آواز لگائی تو بھٹک جائے گا
اس مسافر کو خموشی سے گزر جانے دے

عمران اعوان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ٹھوکروں میں یہی کچھ رہتا ہے
دل بھی دے دینا ، اگر مانگ لیا

غزل

یہ زخمی دل ستانے لگ گیا ہے
مزہ جینے کا آنے لگ گیا ہے

گھڑی پل کو رکو تم اے! بہارو
کوئی کانٹے بچھانے لگ گیا ہے

کوئی تو ہنس رہا ہے آج لیکن
کوئی آنسو بہانے لگ گیا ہے

قدم رکھے چمن میں، جب سے گل نے
گلوں کو ہوش آنے لگ گیا ہے

شجر جو آندھیوں سے ڈر گیا تھا
وہ پاؤں پھر جمانے لگ گیا ہے

زمانہ چین سے کب بیٹھتا ہے
مجھے پھر سے رلانے لگ گیا ہے

خدا کا شکر کہ تو ہنس رہا ہے
ترا غصہ ٹھکانے لگ گیا ہے

تری یادوں کا موسم آ گیا گل!
یہ آنگن چہچہانے لگ گیا ہے

کوکی گل

غزل

سوچ الگ ہو تو پھر آتش میں ہے جلنا پڑتا
ایسے رستے پہ اکیلا ہی ہے چلنا پڑتا

شخصی آزادی نہیں ملتی ہے یوں قوموں کو
راستہ اپنا مکمل ہے بدلنا پڑتا

دیپ اشکوں کے جلا کر سحرِ نو کے لیے
ایک اک فرد کو گھر سے ہے نکلنا پڑتا

ٹوٹ جاتی ہے وہ شے جس میں نہ ہو کوئی لچک
کبھی حالات کے سانچے میں ہے ڈھلنا پڑتا

اپنے من کو ہے یہاں مارنا پڑتا ہر دم
اپنے جذبات کو ہر پل ہے کچلنا پڑتا

اب کسی اور کے شعلوں میں نہیں آتا کوئی
آگ میں اپنی یہاں خود ہے پگھلنا پڑتا

گرنے والے کو سہارا نہیں ملتا ہے یہاں
جو گرے یارؔ اُسے خود ہے سنبھلنا پڑتا

سہیل یار

غزل

تیرا دربار ترا جاہ و حشم اور طرف
اور درویش کا اٹھتا ہے قدم اور طرف

وقت نے گھیر کے اب پھینک دیا اس جانب
جو سمجھتے تھے کہ ہے راہِ عدم اور طرف

شہر کا شہر بہکتا ہوا جاتا ہے کہاں؟
دھیان ہے اور طرف اور قدم اور طرف

منطقی ربط نہیں ذہن کے کرداروں میں
دل نے رکھا ہے کہانی کا بھرم اور طرف

لفظ معنی کے طلسمات سے خالی نکلے
جب زمانے نے بڑھایا ہے قلم اور طرف

آئنہ خاک کا دولخت نظر آتا ہے
دل کسی اور طرف جائے، صنم اور طرف

اس کی فطرت میں توازن کا ہنر ہے صاحب
وقت کا دھیان زیادہ ہے نہ کم اور طرف

دل نے پھر اسم کی گردان سے روکے ہیں قدم
جب بھی اٹھتے ہیں محبت کے قدم اور طرف

لے کے جاتی ہے ہوس بندگلی میں اسحاق
لے کے جاتے ہیں محبت کے الم اور طرف

اسحاق وردگ

غزلیں

دکھ کے موسم میں آسرا ہے تو
جانے کیوں دیر سے ملا ہے تو

کب کہا میں نے بے وفا ہے تو
میری چاہت کی انتہا ہے تو

جانے کیوں خواب دیکھتی ہوں میں
جانے کیوں خواب سا لگا ہے تو

خود سے رہتی ہوں اب خفا سی میں
جب سے مجھ سے خفا ہوا ہے تو

دیر تک جاگتی رہی ہوں میں
دیر تک سوچ میں رہا ہے تو

تجھ سے ہو کر جدا جو قائم ہوں
میرے جینے کا آسرا ہے تو

نائیلہ راٹھور

دیکھ تو کتنا معتبر ہے تُو
چاند تاروں کا ہم سفر ہے تو

آسماں مہربان ہے کتنا
اور نا مہرباں بشر ہے تو

خلد سے جان بوجھ کر نکلا
دیکھ اب کتنا در بدر ہے تو

دھڑکنوں کو جگہ نہیں ملتی
کیوں میرے دل میں اس قدر ہے تو

مجھ میں تیرا قیام لازم ہے
اس مسافر کا بس حضر ہے تو

رخسانہ سمن

غزل

جب سے تھامی ہے اس نے مے اپنی
ڈھونڈتا ہوں اک ایک شے اپنی

شور نے اپنے راگ چھیڑ لیے
خامشی نے لگا لی لے اپنی

ہم سے مخفی نہیں کوئی لمحہ
بہ خدا ہر زبان ہے اپنی

بے یقیں بستیاں ہماری ہیں
بے یقینی اگرچہ نے اپنی

دن کہاں دور ہیں رضاؔ سے مری
روشنی ہو گی پے بہ پے اپنی

نعیم رضا بھٹی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پریشاں رو ، کسی پہلو نہیں تھا
ترا غم موجۂ خوشبو نہیں تھا

غزلیں

بروئے کار کم لایا گیا ہے
صدا کو زنگ یوں تھوڑی لگا ہے
تمہارا شکریہ اے یار، لیکن
ہمارا غم تسلی سے بڑا ہے
حقیقت ہے کہ بینائی کا دھوکہ
شجر ہے خاک پر سایہ کھڑا ہے
امیرِ شہر کی عیاریاں اف
جلا کر شہر دریا بیچتا ہے
کوئی ہے دوسری جانب یقیناً
مری آواز واپس پھینکتا ہے

عزم الحسنین عزمی

وہ تاثر ہی مرے یار الگ ہوتا ہے
دل سے ہوتا ہے جو انکار الگ ہوتا ہے

آپ تلوار سے جیتیں گے فقط جسم مرا
یعنی دل کے لئے ہتھیار الگ ہوتا ہے

ہر نئی چوٹ نیا قہقہہ دیتی ہے ہمیں
ہم بنی عشق کا آزار الگ ہوتا ہے

بھیڑ کا بوجھ بھی پڑتا ہے اٹھانا دن بھر
سر پہ تنہائی کا انبار الگ ہوتا ہے

کہاں آتے تھے تیرے شہر میں ہم
ہمارے پاؤں تو رستہ پڑا ہے
گیا ہوں آج آئینے کے اندر
اٹھا کر عکس باہر رکھ دیا ہے
مسافت سہل ہے کچھ اس لئے بھی
مرے رختِ سفر میں بس دعا ہے

کیسی بستی ہے جو دیتا ہے دکھائی جیسا
اُس سے اُس شخص کا کردار الگ ہوتا ہے

بند کمرے کی جو وحشت ہے الگ ہے عزمی
اک تماشہ سرِ بازار الگ ہوتا ہے

غزل

ہے جھپکن تیز آنکھوں میں نمی ہے
کوئی کشتی ہی دریا میں پھنسی ہے

اسی نے مجھ کو جنت سے نکالا
وہی میرے عمل میں تشنگی ہے

کسی رخسار نے چوما ہوا کو
گلوں میں جو عجب سی تازگی ہے

تری آنکھوں میں چمکی ہے جو دن کو
غزل وہ رات کو میں نے کہی ہے

وگرنہ چل پڑی ہوتی کہیں وہ
وہ منزل دیکھ کر مجھ کو رکی ہے

مجھے جو بھی ملا کافی تھا مجھ پر
طبیعت میں یہی اک سادگی ہے

شہاب اللہ تری تصویر دیکھی
قسم سے دل پہ جم کر رہ گئی ہے

شہاب اللہ شہاب

غزلیں

کہ اِس سے پہلے بھی داغِ جگر مٹانے تک
ہزار بار میں ٹُوٹا تھا مُسکرانے تک

کسی فقیر نے اِک جھونپڑی بنالی ہے
اُسی جگہ پہ جہاں ہم ملے زمانے تک

نظر نہ جھپکی جہاں تک چراغ جلتا رہا
میں جاگتا رہا سُورج کے جاگ جانے تک

اُسی گلی کی طرف کھڑکیاں کھلی رکھیں
اگر چہ لاکھ رسائی ملی زمانے تک

نگاہ پھیر لی حالات کے بدلتے ہی
وہ میرے ساتھ رہا صِرف کام آنے تک

چُھڑا کے ہاتھ وہ گم ہو گیا کہیں قائل
جہاں کی بھیڑ میں کچھ راستہ بنانے تک

عمر قیاز قائل

چل کے دو چار قدم ترک محبت کر دی
مُجھ پہ اُس شخص نے سمجھو کہ قیامت کر دی

سال ہا سال کی کیا کہیئے کہ پل دو پل میں
کچھ بھی سوچا نہیں اور ختم رفاقت کر دی

مشترک تھے کبھی غم بھی مگر اب تو یُوں ہے
اُس نے اِس میری امانت میں خیانت کر دی

ساری آسائشیں خُود لے گیا وہ ساتھ اپنے
میرے حِصّے کی وَدیعت مجھے غُربت کر دی

اپنے آنگن میں ستاروں کو سجا کر اُس نے
ٹِمٹمانے کی مری ختم روایت کر دی

جس سے اِک عُمر رَہا پیار کا رِشتہ قائل
آج اُس شخص نے خُود حدّ عداوت کر دی

غزلیں

تتلیاں ہی ہوں ہمنشیں میری
اس قدر سوچ مخملیں میری

ہے تخیل شفاف پانی سا
اور طبیعت ہے آتشیں میری

میں کہوں نعت احمد مرسل
سوچ ہو جائے نغمگیں میری

یہ سنبھالے گی میرے ورثے کو
میری بیٹی ہے جانشیں میری

میرے سر پر سدا سلامت ہو
ناز زینت ہے اوڑھنی میری

نازیہ رحمان

حد نظر سے دور ہے افلاک سے پرے
دنیا ہے ایک اور بھی ادراک سے پرے

اے کوزہ گر تو دیکھ ذرا غور سے اسے
اک نقش خاک میں ہے یہاں چاک سے پرے

انسان کا خمیر ہے جب خاک سے بنا
کیوں لوگ بیٹھتے ہیں بھلا خاک سے پرے

دل کی نہ کوئی بات زباں پر میں لا سکی
ہوں آج بھی میں لہجہء بے باک سے پرے

آنکھوں میں ناز درد کا ہے سیل یوں رواں
دیکھوں میں کیسے دیدۂ نمناک سے پرے

غزل

پلٹ کے آئے نہیں آسمان سے ہم تو
گزر گئے ہیں محبت میں جان سے ہم تو

ہمارے عشق کی پرواز تھی بلند اتنی
گزر گئے ترے وہم و گمان سے ہم تو

وہ بے وفائی کا کرتا گلہ کسی سے کیا
خرید لائے محبت دکان سے ہم تو!

بدن تھا اپنا گزاری ہے زندگی اُس سے
گریز پا ہی رہے اس جہان سے ہم تو

اسیر ہم کو کیا گلبدن نے آنکھوں میں
ہوئے نڈھال جب اپنی اڑان سے ہم تو

ہماری ناؤ کو دریا ڈبو نہیں سکتا
نکال سکتے ہیں رستہ چٹان سے ہم تو

حکیم خان حکیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چند رفیق مطمئن ، چند حریف دنگ بھی
ایک فریبِ صبح بھی ، ایک فریب جنگ بھی

غزل

زباں بدلنے لگے یا بیاں بدلنے لگے
بدلنے والے کو ٹوکو! جہاں بدلنے لگے

سنبھال سکتے نہیں گھر، جہاں سنبھالتے ہیں
زمیں بدل نہیں پائے ، زماں بدلنے لگے

میں دیکھتا رہا دنیا سیاہ ہوتی گئی
میں دیکھتا رہا آتش زخاں بدلنے لگے

ہم ایسے لوگ جو قرضہ چکا نہیں سکتے
ادھار بڑھنے لگا تو دکاں بدلنے لگے

تمام رات بلاؤں کا رقص تھا انجم
مکین خوف کے مارے مکاں بدلنے لگے

امتیاز انجم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آگ تاپی عجب ، عمر بھر ، بے طلب
جل بجھے ، اور اُٹھا دھواں بھی نہیں

غزلیں

حرفِ نو آج جو دیوار پہ لکھا گیا ہے
وقت کی کاٹتی تلوار پہ لکھا گیا ہے

روک پائے گا نہ یلغار اجالوں کی کوئی
شاخِ مہتاب سے کہسار پہ لکھا گیا ہے

سات دروازوں کے اندر جو کیا تھا چھپ کر
جرم، پیشانیِ اخبار پہ لکھا گیا ہے

ایک الزام ہے جو خلقِ خدا کے لب سے
پھر قبائے شہِ زردار پہ لکھا گیا ہے

رضا اللہ حیدر

تجھ سے تجھی کو مانگنا اک کام ہی تو ہے
یہ درد میرے عشق کا انعام ہی تو ہے

آ کر شبِ سیاہ اجالوں میں ڈھال دو
اشکوں کا ہر چراغ لبِ بام ہی تو ہے

جانا ہے ہم نے سرحدِ افلاک سے پرے
یہ راہ، مُشتِ خاک کو اک گام ہی تو ہے

خونِ جگر ہی پیتے ہیں زنجیر پا پڑے
بادہ کشوں کا شہر میں اکرام ہی تو ہے

میں بھی اُس شوخ کو تشہیب میں لے آؤں گا
جانتا ہوں کہ بہت پیار پہ لکھا گیا ہے

یہ جو دفتر ہے رضا میرے گناہوں سے بھرا
سب مرے آخری انکار پہ لکھا گیا ہے

بجھتی نہیں ہے پیاس مری روح کی وہاں
لب پر خطیبِ شہر کے دشنام ہی تو ہے

کرنوں کا رقص ہو گا طلوعِ سحر کے بعد
ڈھل جائے گی غموں کی رضا شام ہی تو ہے

غزل

میں نے کیا ہے نوٹ یہی رات بھر یہاں
کچھ لوگ اب بھی رکھتے ہیں حسنِ نظر یہاں

کچھ لوگوں کے کلپس نہیں وائرل ہوئے
کچھ لوگ دیکھتا ہوں ابھی معتبر یہاں

آئے کوئی حسینہ کسی کے بھی سامنے
کرتا ہے کون ایسے میں صرف نظر یہاں

اس دشتِ نامراد میں اک قیس کے سوا
دیکھا نہیں کسی نے بنایا ہو گھر یہاں

پوچھا ہے ایک لیلیٰ سے مجنوں نے دشت میں
میرے لیے پکاؤ گی، آلو مٹر یہاں؟

کچھ انٹیلکچول کی ہے بینائی کم مگر
کہتے ہیں لوگ ان کو بھی اہلِ نظر یہاں

محمد علی ایاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد! تو نے دیکھ لیا
ایسا کیا جادو مجھ میں

غزلیں

تجھے دکھ ہے جو میری رایگانی کا
کوئی صورت، کوئی حل بے کرانی کا

مجھے خدشہ، مرے بچوں کا کیا ہو گا
مجھے دکھ دن بہ دن گرتی جوانی کا

کوئی سازش مخلاتی ہے درپردہ
کہ مصنوعی ہے یہ بحران پانی کا

اسی کے ہاتھ میں ہیں ڈوریاں سب کی
کہانی کار سے پوچھو کہانی کا

ہمیشہ کال ہی پر بات ہوتی ہے
کبھی دیدار بھی ہو یار جانی کا

کہاں کا تیر کس کو آ لگے احمد
کہاں ، کب خاتمہ ہو زندگانی کا

احمد محسود

خاص یہ کرب جو عطا ہے مجھے
کسی درویش کی دعا ہے مجھے

اب نہیں یاد کب ہنسا تھا میں
اور وہ دیکھ کر ہنسا ہے مجھے

دل تو پتھر ہوا تھا مدت سے
جانے اِس بار کیا ہوا ہے مجھے

کتنے بے باک ہو گئے سب ہی
آئنہ گھورنے لگا ہے مجھے

علی فیضان جعفری

غزلیں

قدم قدم پہ بچھا کر ہی جال رکھا گیا
ہمارا جینا مسلسل محال رکھا گیا

قسم ہے "عصر" کی، انسان ہے خسارے میں
ہر اک عروج کا کوئی زوال رکھا گیا

میں سہہ رہا ہوں ترے زخم کیوں خموشی سے
مرے خمیر میں اک اندمال رکھا گیا

کچھ اس حساب سے اک دوسرے سے بچھڑے تھے
کہ پھر بھی رابطہ اپنا بحال رکھا گیا

جواب ہوتے ہوئے بھی جواب ہو نہ کوئی
ہمارے سامنے ایسا سوال رکھا گیا

یہ ہم جو پھرتے ہیں بے کارگی لیے اپنی
ہمارے ہاتھ میں یہ بھی کمال رکھا گیا

ملا نہ وقت کبھی تم پہ غور کرنے کا
تمہارے بعد بھی خود کا خیال رکھا گیا

خدا کا شکر کہ اوقات میں رہے ساجد
خدا کا شکر ہمیں حسبِ حال رکھا گیا

ساجد رضا خان

آسمان و زمیں پہ باغ لگا
میں کہاں ہوں، مرا سراغ لگا

تا کہ تیری سمجھ میں آ جاؤں
مجھ کو پورا سمجھ، دماغ لگا

لَو کا صدقہ اتار دیں آنکھیں
مجھ کو آنکھیں نہیں، چراغ لگا

صاف دامن تھما دیا ہے تجھے
اس پہ مَن مرضیوں کے داغ لگا

آب حیرت پلا مجھے ساجد
میرے منہ سے کوئی ایاغ لگا

غزل

دوسروں کی جو بھول ہوتے ہیں
وہ بھی بندھن قبول ہوتے ہیں

وار تو سامنے سے کرنا سیکھ
جنگ کے بھی اصول ہوتے ہیں

کوئی آنکھیں غزل سرا جب ہوں
سارے نغمے فضول ہوتے ہیں

روز ترتیب پاتے ہیں لشکر
روز دفتر میں پھول ہوتے ہیں

چھوڑیئے ، افسرانِ حُسنِ و ادا
آپ کیونکر ملول ہوتے ہیں

اور ہوتے ہیں راہ کا پتھر
ہم تو رستے کی دھول ہوتے ہیں

صائمہ آفتاب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ کو خرید پیار بھرے بول ، بول کر
قیمت چکا مری ، سر بازار دوستی

غزل

تو لائے گا نہیں ایماں کبھی محبت پر
تجھے یقیں جو نہیں ہے مری محبت پر

فریبِ سود و زیاں کے خیال سے پہلے
ہماری گفتگو ہوتی رہی محبت پر

کئی دنوں سے پریشاں دکھائی دیتا ہے
بہت نکلتی تھی جس کی ہنسی محبت پر

میں نفرتوں کے خداؤں سے خوف کھاتا نہیں
مرا یقین ہے قائم ابھی محبت پر

اسی لیے تو قبائل میں جنگ جاری ہے
کہ اکتفا نہیں کرتے سبھی محبت پر

اگر ہے اہلِ زمانہ کی تربیت کرنی
تو صرف بات کرو کام کی محبت پر

ازور شیرازی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سادہ کاغذ بانٹا کیسے
یوں بھی کی ہے عرضِ ہنر

غزلیں

خشک سالی چل رہی ہے
آنکھ خالی چل رہی ہے

ہاتھ مہندی سے رنگے ہیں
رخ پہ لالی چل رہی ہے

دن ہے روشن کیوں ازل سے
رات کالی چل رہی ہے

کر رہا ہوں رقصِ بسمل
اس کی تالی چل رہی ہے

کون دیکھے میری جانب
بے خیالی چل رہی ہے

کانچ جیسی اُس کی گردن
جس پہ بالی چل رہی ہیں

آفتاب محمود شمس

''محبت کی کہانی میں اداکاری نہیں کرنی''
کہ خوابوں کی دکانوں سے خریداری نہیں کرنی

یہی سیکھا محبت سے اگر وہ چھوڑ دے تم کو
تو بس خاموش ہوجانا عزاداری نہیں کرنی

جو حالت آج میری ہے یہ مُجھ سے صاف کہتی ہے
کہ مستقبل میں اس دل کی طرفداری نہیں کرنی

تعارف زین ہے اور فخر سے میں ایک سید ہوں
ارے کوفی دلاں کیا ہم سے غدّاری نہیں کرنی؟

زین علی رضوی

غزلیں

کہاں میری طرح تجھ پر مرے گا
'مرا دشمن ابھی صدیوں جیے گا'

بُلایا ہے مجھے اِک جل پری نے
'دھواں تو اب مجھے ہونا پڑے گا'

وہ اپنا سر مرے کاندھے پہ رکھ کر
مجھے تُم سے محبت ہے کہے گا

ہمیں کوہِ ندا سے آ رہی ہے
کوئی آواز ، جانا ہی پڑے گا

جب ایسے طور سے دھڑکے گا یہ دل
کہاں کوئی اِسے وحشی کہے گا

وہ آئیں گے ہمارے دل میں اک دن
مکاں اپنا بھی آخر گھر بنے گا

ترے عارضؔ پہ خال و خط کو کب تک
کوئی کب تک کہاں کیسے تکے گا

سرفراز عارض

تلخ و شیریں تھا روزگار کا باغ
خالی رکھا نہ بھر کے رکھا ایاغ

عمر کے روسیاہ کلنڈر میں
کیا لگائیں گئے دنوں کا سُراغ

نہ رہا شعر میں تُمھارا خیال
اب کہاں رہ گیا وہ پہلا دماغ

میر کے جیسے بد دماغ ہیں ہم
اپنا ملتا نہیں کسی سے دماغ

دل جلاؤ تو روشنی ہو گی
کام آتے نہیں دیے و چراغ

باز آتے نہیں اُڑان سے ہم
تاک میں رہنا ہے وتیرۂ زاغ

پیارے عارضؔ پہ پیار آتا ہے
ہم کو اُس کے سوا نہیں ہے دماغ

غزلیں

میرا شیوا نہیں ہے غداری
میری فطرت میں ہے وفاداری

دل نے رکھا ہے صبر کا روزہ
تیری قربت سے ہو گی افطاری

دشت زادے ہیں لشکری اس کے
کر رہا ہے یہ عشق سالاری

بن ترے ہے اداس مدت سے
میرے گھر کی یہ چار دیواری

ہم قلندر مزاج لوگوں کو
راس آتی نہیں ہے سرداری

سب تمنائیں راکھ کرتی ہے
رنج و غم کی بس ایک چنگاری

میں حقیقت پسند ہوں ساحل
مجھ کو آتی نہیں اداکاری

ارسلان ساحل

اس جہاں سے پہاڑیے چلیے
خیمۂ جاں اکھاڑیے چلیے

یہ نگر ہے قلندروں کا حضور
اپنے دامن کو جھاڑیے چلیے

ہم بھی درپن کو ٹوٹتا دیکھیں
حسن کے تیر گاڑیے چلیے

میں کسی قیس کا نہیں پیرو
میرے سر پہ نہ دھاڑیے چلیے

عشق پر ہی اگر اڑے ہیں آپ
اپنا حلیہ بگاڑیے چلیے

اس زمیں کا خمیر ہیں ہم سب
مت اسے یوں اجاڑیے چلیے

خواب کھڑکی سے ہو گئے رخصت
دامنِ چشم جھاڑیے چلیے

دل سے لپٹی ہوئی ہے جو ساحل
اس تمنا کو تاڑیے چلیے

غزل

بار بار آزمانے والا کون
تُو اِدھر آنے جانے والا کون

آسمانوں کے اُس طرف کیا ہے
تُو فسانے سنانے والا کون

مَیں تجھے خود بھلانے والا ہوں
تُو مجھے بھول جانے والا کون

مَیں تو خود راہ بھول جاؤں گا
تب مجھے ڈھونڈ لانے والا کون

میری منزل جہاں ہو، جو بھی ہو
تُو مرے ساتھ آنے والا کون

یہ مرے اپنے مسئلے ہیں نوید
تو مرے رنج اٹھانے والا کون

نوید صادق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

برے دنوں کے دکھی ساعتوں کے ساتھی ہیں
یہ لوگ بھی مرے غارت گروں کے ساتھی ہیں!

نشاطیہ وفور اور رمزیہ طنز کی شدّت سے پھوٹنے والی شاعری

شاعرِ امروز

جواد جاذل

(جیم جاذل)

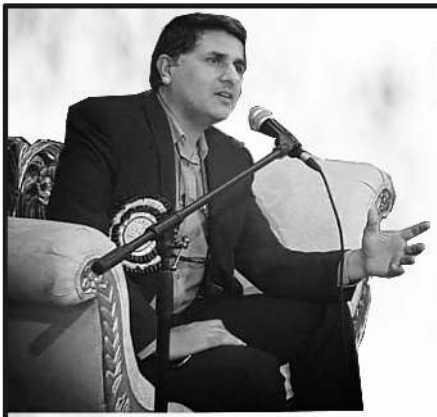

شاہد ماکلی

پوسٹ ماڈرن ازم کے معروف مصری نژاد امریکی سکالر ایہاب حسن نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا تقابلی چارٹ مرتّب کیا تھا۔ یہ چارٹ کم و بیش تیس نکات پر مشتمل تھا جن میں مابعد جدیدیت کے دو عناصر بہت اہم تھے، پلے فُل نیس اور آئرنی۔ جواد جاذل کی غزل میں یہ دونوں عناصر تشکیلی و ترکیبی اجزاء کے طور پر خاطر خواہ قوت کے ساتھ کارفرما ہیں۔ ان کی غزل میں مسرت خیزی، نشاطیہ وفور اور رمزیہ طنز اور تیکھا پن بین السطور موجزن ہیں۔ کئی مقامات پر رمزیہ طنز (آئرنی) کی یہ لہر بپھر کر کاٹ دار اور احتجاجی ہو جاتی ہے۔ لہجے کی سلاست اور بے ساختہ پن اس پہ مستزاد ہے۔ آپ ایک بار ان کے چمن زارِ غزل میں داخل ہو جائیں تو سیرِ آثار تمام کیے بغیر نہیں رہتے۔ جواد جاذل چھوٹی بحر کے بہت کامیاب اور تند و توانا شاعر ہیں۔ معنیٰء بیگانہ ان کی شعری پھلواریوں میں سبزہء بیگانہ کی طرح پھوٹتا ہے۔

جواد جاذل (جیم جاذل) کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ وہ کئی سالوں سے برمنگھم (یوکے) میں مقیم ہیں۔

ذیل کا شعری انتخاب غزل کے قاری سے ایک سنجیدہ قرات کا تقاضا کرتا ہے:

تم لگاؤ ہوا کو باتوں میں
میں جلاتا ہوں ایک اور چراغ

.....

اس لیے منہ چھپائے پھرتے ہیں
ہم ہوئے ہیں نئے نئے رسوا

.....

دریا ہم کو ڈھونڈ ہی لیں گے
نام سمندر رکھ لیتے ہیں

.....

یہ میری پہلی محبت ہے، کُھل کے بات کرو
ابھی سمجھ نہیں آتی زباں اشاروں کی

اسی باعث کھڑا رہنے میں دقت پیش آتی ہے
ہمارے خاک کے پتلے میں نم تھوڑا زیادہ تھا

.....

اب تعلق میں سبھی کچھ ہے محبت کے سوا
خوب ہنستے ہیں، کسی بات کا رونا نہیں ہے

.....

رونے لگتے ہیں جیتنے والے
ہنسنے لگتا ہوں ہر شکست کے بعد

.....

یوں بھی اک دن تو مر ہی جانا ہے
آؤ اک دوسرے پہ مر جائیں

.....

ایک دو دن رہا اندھیرے میں
پھر نظر آنے لگ گیا مجھ کو

.....

اس نے یونہی تو دی نہیں ہو گی
جان انمول چیز ہوتی ہے

.....

ہنستے رہنے میں ہے بقا جاذل
اشک نکلے تو جسم گارا ہوا

.....

ہنس رہا ہوں میں اپنی حالت پر
تم بھی مجھ پر ہنسی خوشی ہنس لو

.....

منفرد ہو تو پھر نظر آؤ
رو رہے ہوں اگر سبھی ، ہنس لو

.....

روز کرتے ہیں ایک تازہ گناہ
آخری آخری کے چکر میں

بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے لیے
جتنے رستے چنے ، خراب چنے

.....

آپ اچھے ہیں کون مانے گا
میں برا ہوں یہ مانتا ہوں میں

.....

سچ کے رستے پہ نقشِ پا کم ہیں
دیکھنے دُور تک گیا ہوں میں

.....

میرے جانے پہ کون روئے گا
اپنے آنے پہ ہنس رہا ہوں میں

.....

یاد کی بھی نہیں رسائی جہاں
اس قدر دُور ہو گئے مرے دوست

ملنے آئے ہیں مجھ نکمے سے
کتنے مجبور ہو گئے مرے دوست

میں وہیں ڈھیر ہو گیا جاذل
اور مفرور ہو گئے مرے دوست

.....

میری صدا، صدائے مکرر میں دب گئی
مصرعے میں نام یار کا لانے کی دیر تھی

ملنے لگی زمین بھی قدموں کی گونج سے
پہلا قدم اٹھا کے دکھانے کی دیر تھی

.....

پکارتی ہے زمیں ، اے خدائے کُن! ذرا سُن
بشر کے ہاتھ سے، لگتا ہے، اب نکل گئی بات

نہ بند باندھ مرے آگے التجاؤں کا
میں جا رہا ہوں کسی اور ہی بہاؤ میں

.....

نہیں ہے راس تعلق تو توڑ دے جاذل
لگا یہاں پہ انگوٹھا ، یہ کاغذات پکڑ

.....

اٹک گیا ہوں کسی بے کشش خلا میں کہیں
زمیں بھی ہاتھ سے نکلی فلک کے چاؤ میں

.....

ہمارے چھوڑے ہوئے راستوں پہ چلتے ہوئے
ابھر رہے ہیں کئی آفتاب ڈھلتے ہوئے

.....

میں اِس کنارے پہ تنہا، وہ اُس کنارے پر
یہ دو کنارے ہماری جڑوں میں بیٹھ گئے

.....

میں اہلِ جہل پہ اک نظم لکھنے والا ہوں
اسی لیے تو گریزاں ہیں صاحبانِ خرد

.....

حادثے بے نشاں نہ رہ جائیں
ایک سیلفی بنا کے چلتے بنو

.....

اتنے معصوم ، اس قدر سادہ
تم زمیں پر نئے نئے ہو کیا

.....

شعر اپنے نہیں تو کیا صاحب
خیر سے صاحبِ کتاب تو ہیں

.....

چل پڑے وقت کا پہیہ الٹا
اور ترا ساتھ مکرر ہو جائے

تیری ہر بات ہے سر آنکھوں پر
میری ہر بات ہی رد ہے ، حد ہے

.....

بند آنکھوں سے اجالا دیکھو
خواب دیکھو تو نرالا دیکھو

.....

لوگ پتھر تو مارتے نہیں اب
پھر محبت ہی کیوں کرے کوئی

.....

پوری طاقت سے دے مارا میں نے مُکّا شیشے پر
غصہ اپنے ہونے پر تھا ، اور اتارا شیشے پر

.....

میں زمانے کے ساتھ چل نہ سکا
یہ خطا ہے تو پھر خطا ہی سہی

.....

ڈر وبا کا اتر ہی جانا ہے
سب نے اک دن تو مر ہی جانا ہے

.....

ست قدموں سے جا رہا ہوں جدھر
بھاگ کر بھی ادھر ہی جانا ہے

.....

ایسے فرقت میں سانس چلتی ہے
ٹھہرے پانی میں جیسے ناؤ چلے

.....

دھیمے سُروں میں بات کا نشہ ہی اور ہے
یہ بات کہہ رہا تھا کوئی دھاڑ دھاڑ کر

.....

اک دن پھیکا پڑ جائے گا
کچا رنگ ریا کاری کا

جس میں دنیا ہاتھ سے نکلی
لمحہ تھا اک سرشاری کا

.....

چلو اک دوسرے میں ڈوب جائیں
سمندر میں تو گہرائی نہیں ہے

.....

اگر آنکھوں کا نم خالص ہے جاذل
تو کیوں آواز بھرائی نہیں ہے

.....

بھروں گا زندگی میں آٹھواں رنگ
ابھی تک سات گردش کر رہے ہیں

.....

رات ہوئی تو سارے بدن میں پھیل گئی
دن بھر جتنی آگ اتاری آنکھوں میں

.....

آؤ دیکھا نہ تاؤ کود پڑے
جل رہا تھا الاؤ کود پڑے

.....

یہ نہ دیکھا کہ کون ہے جاذل
جو بھی چیخا بچاؤ کود پڑے

.....

میں بھی خاموش ہو گیا تو پھر
کون بولے گا میرے حق میں یہاں

.....

میں کیک کھاتا رہا اور خوشی مناتا رہا
اک اور سال مری زندگی سے جاتا رہا

پرانے زخم کریدے تو شعر تازہ ہوئے
سو داد ملتی رہی، میں غزل سناتا رہا

☆☆☆☆☆☆

ہو چکے تھے جو پیار میں ناکام
اب وہی کامیاب شاعر ہیں

.....

نہ تازگی نہ رچاؤ نہ شعریت جاذل
غزل تو قافیہ پیمائی بن کے رہ گئی ہے

.....

شبد زندہ رہیں کہ مر جائیں
اپنے حصّے کی بات کر جائیں

حکم تھا ، چھوڑ کر چلے جاؤ
کچھ بتایا نہیں ، کدھر جائیں

خاک پا ہیں ، پڑے رہیں گے یہیں
آپ خوش باش اپنے گھر جائیں

رینگتے جائیں مسجدوں کی طرف
دنیا داری کو دوڑ کر جائیں

پانی سر سے گزر نہ جائے کہیں
توبہ توبہ کریں ، سدھر جائیں

.....

آنے ہی کب دیا گیا تعبیر کا خیال
خوابوں کی دیکھ بھال میں الجھا دیا گیا

.....

نہیں لوں گا کسی کے نام کی بیساکھیاں جاذل
جہاں تک جا سکا میں پاؤں پاؤں چل کے جاؤں گا

نئے ستاروں کو دریافت کرنا پڑتا ہے

شاعرِ امروز

نادر عریض

شاہد ماکلی

نادر عریض کا سب سے زیادہ قابلِ توجہ اور اہم شعری جوہر ان کی غزل میں ارسل بالمثل کی کارفرمائی ہے۔ ارسل بالمثل کے لفظی معنی ہیں مثال کے ذریعے ترسیل۔ یہ ایک ایسا شعری وسیلہ ہے جس میں ایک مصرعے کے بیانیے کو دوسرے مصرعے میں کوئی مثال یا امیج لا کر تقویت دی جاتی ہے۔ یہ سبکِ ہندی کا مقبول شعری وسیلہ ہے۔ نادر عریض کی کامیاب اور معروف شاعری کا زیادہ حصہ اسی اسلوب پر مشتمل ہے۔ ارسل بالمثل کے بہت عمدہ نمونے ان کے ہاں اپنی پوری تاثیریت کے ساتھ ملتے ہیں۔ اس طرح کے اسلوب کو اپنانے میں سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش آتا ہے کہ اوسط درجے کا شاعر روایت میں برتے گئے سامنے کے امیجز یا مثالوں کو ہی دہراتے رہنے پر قناعت کر لیتا ہے۔ یوں اتنا اعلیٰ شعری اسلوب کلیشیائی اور پامال تمثیلوں کے اعادے سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ مگر نادر عریض کا خاصہ یہ ہے کہ یہ اسلوب پوری توانائی اور وفور کے ساتھ ان کے باطن سے پھوٹتا ہے۔ جس کی عملداری کسبی سے زیادہ ہبی اور فطری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمثیلیں تازہ، توانا اور بے ساختہ ہیں۔ حسیاتی سطح پر ہمارے عہد کے منظر نامے سے جڑتی ہیں، اس لیے متاثر کن بھی زیادہ ہیں۔ ان کے نعتیہ اشعار بھی اعلیٰ معیار کے ہیں جن کی قرات اپنے پڑھنے والوں کے اذہان و قلوب پر سرشار کن اثرات مرتب کرتی ہے۔

نادر عریض۔ 10 اگست 1990 کو بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ 2013ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ذیل میں ان کا نمونہ کلام:

آخری عمر میں جاتے ہیں مدینے ہم لوگ
مرنے لگتے ہیں تو جینے کا خیال آتا ہے

.....

خدا کی مرضی بتا رہا تھا بچھڑنے والا
وہ جانتا تھا کہ گیلی لکڑی دھواں کرے گی

.....

پیار کرتا ہوں مگر اس کو بتاتا نہیں میں
ایک مصرع ہے، گرہ جس پہ لگاتا نہیں میں

.....

شعلہ دیے کو زندگی دیتے ہی بجھ گیا
منظر سے ہٹ گیا اسے منظر پہ لا کے میں

.....

بری نظروں سے بچنا ہے تو مجھ کو ہمسفر رکھ لے
مکانوں کا تحفظ چار دیواری سے ہوتا ہے

.....

میں اسے چاہنے والوں میں گھرا چھوڑ گیا
یعنی اس پیڑ کو اتنا ہی گھنا چھوڑ گیا

.....

کوئی شگوفہ تمھارے ہنسنے کا منتظر ہے
کسی نظارے کو دھوپ آ کر عیاں کرے گی

.....

یہ لوگ پہلے کہاں ہاتھ چومتے تھے مرے
یہ پیار تو مرے حصے میں نعت سے آیا

.....

ستائے جاتا تھا لفظوں کی رائیگانی کا دکھ
پھر ایک نعت نے اس زخم کا ازالہ کیا

.....

رونا آتا ہے بہت اپنے ادھورے پن پر
تیس غزلیں ہیں، مگر نعت نہیں ہے کوئی

.....

گھروں میں بیٹھے ہوئے کامیابی چاہتے ہیں
ہمیں دعاؤں کا چسکا لگا دیا گیا ہے

.....

میں محبت کے خدوخال سے واقف تو نہیں
اپنے ماں باپ کا خاکہ ہے مری نظروں میں

.....

تمہارے دعووں پہ نادر خوشی ہوئی لیکن
ہم آزماتے ہیں ، پھر اعتبار کرتے ہیں

.....

راستہ ختم مکانوں کے تجاوز سے ہوا
میں نے جب نقشہ بنایا تھا، گلی رکھی تھی

.....

ہماری زمیں اور ہماری بقا کے لیے پیڑ کتنے ضروری ہیں سوچو
کسی اور سیارے پر اس قدر آکسیجن نہیں کیونکہ جنگل نہیں ہیں

.....

پڑھائی ادھوری، عبادت ادھوری، محبت بھی ناکام، گھر بھی ادھورا
مبارک تو بنتی ہے پوری غزل پر، جہاں اتنی چیزیں مکمل نہیں ہیں

.....

ایک جھوٹا بیان دینے سے
دو قبیلوں میں جنگ ٹل گئی ہے

.....

دریا کے بعد تھا مجھے بارش کا آسرا
سوکھے کنویں کو ریت سے بھرتا نہیں تھا میں

.....

اچھا ہوا کسی کی محبت میں پڑ گیا
کوشش کے باوجود سدھرتا نہیں تھا میں

.....

رہ بھی سکتا ہے ترا نام کہیں لکھا ہوا
سارے جنگل کی تو پڑتال نہیں کر سکتے

.....

سبھی آئے ہیں شہادت کی تمنا لے کر
جنگ میں اس لیے محتاط نہیں ہے کوئی

.....

اکیلے پن کی شکایت کروں تو کہتا ہے
تمھارے جیسوں کا انجام رائیگانی ہے

.....

کون کس سمت ہے، آواز سے آتی ہے سمجھ
آج کل اتنا اندھیرا ہے مری دنیا میں

.....

بوسہ دیتے ہوئے بولا تھا ، یہ قرض
آپ واپس نہیں کر پائیں گے

.....

زمین چھوڑ کے ٹھیلے لگا رہے ہیں کسان
کہ آمدن سے زیادہ لگان ہے اس کا

.....

وہ موج آئی، مرے پاؤں چھو کے لوٹ گئی
یہ دیکھ، ریت پہ اب تک نشان ہے اس کا

.....

چیزیں گرتی گئیں رستے میں پھٹے تھیلے سے
چور غفلت میں ٹھکانے کا پتا چھوڑ گیا

صرف آتے ہوئے قدموں کے نشاں ملتے ہیں
خود کہاں ہے جو کنارے پہ گھڑا چھوڑ گیا

.....

پہلی پہلی اذان مشکل تھی
تم نے دیکھا ؟ فضا بدل گئی ہے

.....

ہجر کی رات کٹ نہیں رہی دوست
اور یہ رات آخری نہیں ہے

.....

اک روز اچانک اسے دیکھا تھا گلی میں
یہ خواب کبھی میں نے دوبارہ نہیں دیکھا

.....

محافظوں کی نظر سے بچ کر عبور کرنا ہے اس گلی کو
اور اس میں گمبھیر مسئلہ ہے جگہ جگہ روشنی کا ہونا

.....

میں ایسے مالی کے ہاتھ سونپوں گا باغ دل کا جسے پتا ہو
شجر کی نشوونما میں بہتر رہے گا کتنی نمی کا ہونا

.....

مجھے پتا ہے میں اس کی نظروں سے گر گیا ہوں
مری توجہ بھی اب اسے بدگماں کرے گی

.....

نئے ستاروں کو دریافت کرنا پڑتا ہے
وہ مجھ کو ڈھونڈنے نکلا تو میں ملوں گا اسے

.....

ماننے کو کوئی تیار نہیں ہوتا تھا
میں جب ابھرا تھا، چمک دار نہیں ہوتا تھا

.....

میری نظریں نہیں ہوتی تھیں بدن پر اس کے
چھو بھی لیتا تو گنہگار نہیں ہوتا تھا

.....

اس در کے بند ہونے کا بدلہ لیا ہے دوست
جو بیچتا رہا ہوں دریچے بنا کے میں

☆☆☆☆☆

گمشدہ تنخواہیں [طنز و مزاح]

کرونائی وباء جیسے جیسے بڑھتی گئی اس رفتار سے کرونائی ادب بھی تخلیق ہوتا رہا۔ کرونائی ادب کی تخلیقی کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے میں نے قلم کو حرکت دینے کی ٹھان لی اور موضوع رکھا ''گم شدہ تنخواہیں''۔ مجھے بیگم اقدس نے مشورہ دیا کہ میاں اس موضوع سے چشم پوشی اپنائیں اور قلم کو حالات ''قلم بند'' کرنے سے روک لیں۔ میں نے جواب دیا، ارے پگلی ..... جب پرائیویٹ ادارے ہمارا خون چوس سکتے ہیں ہمارے حقوق پائمال کر سکتے ہیں - دن میں بھی تارے دکھا سکتے ہیں۔ دن دہاڑے جھوٹ بول سکتے ہیں، اپنے وعدوں سے انحراف کر سکتے ہیں اور تو اور جب ہماری تنخواہیں ہڑپ کر سکتے ہیں تو میں اس موضوع پر کیوں نہیں لکھ سکتا اور ساتھ میں یہ شعر بھی گنگنایا:

بے بس ہیں، بے زبان ہیں مقدر کے سامنے
کھلتی نہیں زبان، ستم گر کے سامنے

.....

تذکیر و تانیث کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ تنخواہ کے لیے ''تنخواہ شریف'' یا ''تنخواہ شریفہ'' کا لفظ استعمال کیا جائے.....؟ بہرحال بات ہے ''تنخواہ شریف'' کی لیٹ تشریف آوری کی۔ بھئی بڑوں کے سامنے کہنے سے تو رہے اور کوئی بھی صاحب بہادر بن کے ان کے سامنے اُف تک نہیں کر سکتا۔ تو سوچا کیوں نہ اپنے مجروح احساسات اور مچلتے جذبات کو الفاظ کی شکل دوں کیونکہ ہمارے صبر نے بھی جواب دے ہی دیا۔ تیس اور اکتیس دن بعد تو ہلال کمیٹی والوں کو بھی چاند نظر آ ہی جاتا ہے لیکن ہماری تنخواہیں دور دور تک نظر آنا تو دور کی بات، کہیں ان تنخواہوں کا نام و نشان بھی نہیں۔ عظیم ٹیچرز اور لیکچررز کی بے بس اور گم شدہ تنخواہیں نجانے ہندوستانی ڈراؤنی ڈراموں کی بدروحوں کی طرح کہاں کہاں بھٹک رہی ہیں۔ بچوں کو لالی پوپ چوسنے میں اتنا مزہ نہیں ملتا ہوگا جتنا ہم صاحبان کو بروقت تنخواہ ملنے پر آتا ہے۔ لیکن معاملہ یہاں اُلٹ ہے مہینے بعد تنخواہ کی اُمید کرنا ایسا ہی ہے جیسے ''انگور کھٹے ہوں''۔

جناب روزانہ کی بنیاد پر جو معاوضہ دیا جاتا ہے اُسے ڈیلی ویجز کہتے ہیں۔ مہینے بعد جو

ہمایون خان

ملتی ہے اُسے ماہانہ تنخواہ کہتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے جب اُسی ۸۰ اور نوے ۹۰ دنوں بعد جو اکلوتی اور لاڈلی تنخواہ دی جائے اُسے کیا کہا جائے.....؟

آج کے دور کے حضرت انسان نے بہت کمزور یادداشت پائی ہے جیسے ہی اُس کے بازوؤں میں طاقت، جیب میں روپیہ اور قلم پہ اختیار آجائے تو اس کی گردن اور مزاج دونوں میں تناؤ آجاتا ہے۔ پرائیویٹ سکولز اور کالجز کے سربراہان نے آج کل ہمارا ایسا بُرا حال کر دیا ہے جیسے امریکن سُنڈی فصل کا کرتی ہے۔ لیکن یہ صاحبان یہ بھول جاتے ہیں کہ دُنیا میں مکافاتِ عمل کا ایک سلسلہ بھی چلا آرہا ہے۔ اور "جیسا کرو گے ویسا بھرو گے" کا عمل بھی جاری و ساری رہتا ہے۔ تنخواہوں سے محرومی کا سلسلہ صرف ہمارے ہاں نہیں چل رہا بلکہ ملک بھر میں ہر صوبے اور ہر شہر میں بھنگتی تنخواہ کا رواج پروان چڑھ رہا ہے۔ ان ٹیچرز اور لیکچررز کی آہ و بکا سننے والا کوئی نہیں ایسی بے چارگی کے دنوں میں تنخواہ کے لئے تھگ دو کرنا "بھینس کے آگے بین بجانے" کے مترادف ہے۔ اب صرف اتنا عرض ہے کہ:

ایسا نہ ہو یہ درد بنے درد لادوا
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

.....

حضرات! آج کل تنخواہیں بھی بالغ ہوتی جارہی۔ مہینے کے پہلے عشرے میں بچپن اور لڑکپن گزار لیتی ہیں۔ دوسرے عشرے میں جوان ہو جاتی ہیں اور تیسرے عشر میں بالغ ہو جاتی ہیں اور اگلے مہینے کی پہلی تاریخ (یکم) آتے ہی بالغ ہو جاتی ہے اور باپردہ ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پھر کم کم ہی نظر آتی ہیں۔ تنخواہ کا حصول اتنا طویل ہو جاتا ہے عقل دھنگ رہ جاتی ہے۔ بھئی اتنے دنوں میں تو اچھا خاصا گھریلو اچار بن جاتا ہے۔ انڈوں پر مرغی بیٹھی رہے تو رنگ برنگے چوزے نکل آتے ہیں۔ درختوں پر آم پک جاتے ہیں۔ جامن کے درخت پر جامن اپنے جامنی رنگ میں تبدیل ہو کر کھانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اتنے دنوں میں تو خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑ لیتا ہے اور تو اور اتنے دنوں میں تو املی کی گھلیاں بھی کھٹی مٹھاس کے ساتھ "صنفِ نازک کے نرم و نازک" ہاتھوں تک پہنچ جاتی ہیں مگر ہائے رے میری تنخواہ.....!!

نہ تو آئے گی نہ ہی چین آئے گا

.....

آج کل ہماری حالت بھی اُن دودھ پیتے بچوں کی طرح ہو گئی ہے جو رات کو مسلسل بے چین رہتے ہیں۔ ہم بھی بے چین کیوں نہ رہیں..... وجہ.....وہی تنخواہ.....بھئی نہ جانے ہماری یہ تنخواہیں کس بھٹی میں تیار ہو رہی ہیں۔ جو پکنے کا نام نہیں لے رہیں۔

بعض پرائیویٹ سکولز اور کالجز اپنے ایمپلائز کے ساتھ مشفقانہ، برادرانہ اور ہمدردانہ رویہ رکھے ہوئے ہیں اور اپنے ایمپلائز کو سہولیات مہیا کرتے ہیں لیکن بعض اپنے ایمپلائز کے

ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ''رسی جل جائے مگر بل نہ جائے''۔ اگرچہ بیشتر پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں صباحی اسمبلی میں علامہ اقبال کی دُعائیہ نظم کا یہ شعر بھی پڑھا جاتا ہے:

میرے اللہ بُرائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اُس رہ پہ چلانا مجھ کو

.....

لیکن حالات اور واقعات علامہ اقبال کے اس شعر کی نفی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حالات جوں کے توں ہیں اور ہم تنخواہوں کے لئے بے چین و بے قرار ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سچ سننا انتہائی مشکل ہوتا ہے مگر سچ پڑھنا اس سے بھی کہیں زیادہ ہضم نہ ہونے والا عمل ہے جبکہ سچ لکھنا بڑے ہی دل گردے کا کام ہے۔ اب یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ پرائیویٹ سکولز اور کالجز والے اپنا ''اپنی بیل منڈھے پر چڑھانے'' کے لئے ہزار جتن کرتے ہیں ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' کی ضرب المثل ان پر صادق آتی ہے۔ لیکن اُن کی بیل تو جیسے تیسے منڈھے پر چڑھ جاتی ہے ہماری لیے نہ بیل رہتی ہے اور نہ چڑھنے کی سبیل۔

ادیبوں کو دانشمندی اور تجربہ کار مخلوق کا درجہ حاصل ہے۔ اسی مخلوقیت کے چکر میں ہم نے مطلوبہ مسئلہ اپنے ادیب دوستوں کے سامنے پیش کیا۔ بعض دوستوں نے تو صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے گم شدہ تنخواہوں کی فاتحہ پڑھ لی۔ لیکن اس کے باوجود چند ادیب دوستوں نے مفید مشورے بھی دیئے۔ ایک مہربان دوست نے رائے دی کہ ''تنخواہ'' کے لئے ریسکیو 1122 کا سہارا لو اور اسی میں بیٹھ کر تنخواہ کے لئے کالج چلے جاؤ تا کہ ان کو آپ کی شدت حاجت کا احساس ہو جائے۔ ایک دوست نے نسوار کی تہہ بٹھاتے ہوئے کہا آپ بینڈ باجے (ڈی جے) کی ٹیم ساتھ لے جائیں شاید وہ مست ہو کر آپ کو تنخواہ کی ادائیگی کر لیں۔ ایک اور مہربان قدردان دوست نے مشورہ دیا کہ آپ ''ہاتھ بجانے والی جنس'' ساتھ لے جائیں پھر شاید تنخواہ کے حصول میں آسانی میسر ہو۔ ایک بے تکلف دوست نے تو حد ہی کر دی کہنے لگا اپنے خاندان میں کسی بزرگ کی ٹوڑی ململ سے باندھ لو اور تصویر وائس ایپ کر لیں اور کالج سربراہ سے کہہ دیں کہ حضرت وفات پا چکے ہیں، تدفین کے لئے رقم کی اشد ضرورت ہے۔ ''گم شدہ تنخواہیں'' یکمشت بطریق احسن ارسال کر دیں تا کہ تدفین کے فرائض بخوبی سرانجام پا سکیں۔ ''اگلی تنخواہ کی تازہ ترین وصولی'' تک دُعا گو رہوں گا کیونکہ ہم سب اُمید سے ہیں۔

صبح سویرے گھر سے نکلتے ہوئے بیگم صاحبہ قیاس کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے پوچھتی ہے کہ تنخواہ کب ملے گی لیکن صوم و صلوٰۃ کی پابند بیگم صاحبہ اگلے ہی لمحے ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ رُخصت کرتی ہے۔ تو جی چاہتا ہے کہ اُن کو گھوڑے، اُونٹ، بھیڑ، بکریاں حتیٰ کہ چوزے تک بیچ کر خواب

خرگوش کے مزے لینے سے نہ جگایا جائے۔

جب انسان ذہنی خلفشار اور اُلجھن کا شکار ہو۔ ہر وقت دل و دماغ اور ذہن تنخواہ ملنے اور نہ ملنے کی غیر یقینی صورتحال سے دوچار ہو۔ گھر کا ہر فرد چھوٹا ہو یا بڑا، بچے اور بیگم اقدس گھور گھور کر تنخواہ ملنے کی آس لگائے ہوئے ہوں تو بخدا سانسیں گلے میں اٹک جاتی ہیں۔ کام کرنے والے کا معاوضہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے دینے کی اسلامی واخلاقی تلقین پر کوئی عمل پیرا نہیں ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ ہم مسلسل محنت کرتے ہیں تو ہمارا پسینہ خشک ہی نہیں ہوتا۔ اب تو دل عجیب طرح سے گھبراتا ہے۔ بقول شاعر:

یہی انداز تجارت ہے تو کل کا تاجر
برف کے باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

آج کے جدید سائنسی، معاشرتی و معاشی نفسانفسی کے اس دور میں سب سے زیادہ مظلوم شعبہ اور طبقہ پرائیویٹ ٹیچرز اور لیکچررز کا ہے۔ آج کل تو سب گُم سُم نیم دیوانگی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ حال یہ ہے کہ ایسے سفید پوش، باحیا اور انا پرست کے اپنی جائز تنخواہ کے حصول کے لئے بھی کلرک آفس جاتے ہوئے شکل و صورت اور چہرے سے اتنے معصوم اور شرمیلے نظر آتے ہیں جیسے پہلی بار سسرال کی دہلیز پر قدم بوسی کا شرف حاصل کر رہے ہوں۔ ہماری "گم شدہ تنخواہیں" بھی کرونا ویکسین کی طرح آج کل قسطوں میں مل رہی ہیں۔ سونے پے سہاگہ یہ کہ اب تو حد ہو گئی کیونکہ رہی سہی "گم شدہ تنخواہوں" سے مزید کٹوتیاں وقتاً فوقتاً ہو رہی ہیں۔ کبھی ٹیکس کٹوتی، کبھی انشورنس کٹوتی، ورکشاپ کٹوتی، ویلکم اور فیئرویل پارٹی کٹوتی، انگلش لینگویج کلاس کٹوتی، اور صاحب اس طرح پھر ان کٹوتیوں کا سلسلہ اتنا طویل در طویل ہو جاتا ہے کہ ہم غریبوں کے ساتھ صرف اور صرف سوچنے، سمجھنے اور پرکھنے کی "کسوٹی" ہی باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن ہمارے اساتذہ انتہائی سادہ لوح ہیں کہ یہ پرائیویٹ ادارے ان کے ساتھ "سانپ سیڑھی والا میٹھا کھیل"، کھیل رہے ہیں۔ بقول شاعر:

وہ اس کمال سے کھیلا تھا عشق کی بازی
میں اپنی فتح سمجھتا تھا مات ہونے تک

اگر پرائیویٹ ادارے درس و تدریس کی کشتی کو تلاطم خیز موجوں میں پار لگانا چاہتے ہیں تو پھر ان کو کشتی کے چپو میں توانائی، ہنر و کمال، مضبوطی اور چپو کی لچک کو برقرار رکھنا ہوگا ورنہ اندیشہ ہے کہ میں بھی نقل مکانی پر مجبور ہو جاؤں یا مجھے نکل مکانی کا پروانہ تھما دیا جائے مگر نقل مکانی تو اپنی مرضی سے ہوتی ہے اور نکل مکانی دوسروں کی مرضی سے۔ کیونکہ نکل مکانی میں آپ کو نکالا جاتا ہے۔ لیکن میں یہ نہیں کہوں گا کہ "مجھے کیوں نکالا......؟؟" بلکہ میں فرصت اور فراغت کے لمحات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے غنیمت سمجھ کر ابنِ انشاء کا یہ شعر گنگناتا ہوا رختِ سفر باندھ لوں گا کہ:

انشاء جی اُٹھو، اب کوچ کرو
اس شہر میں جی کو لگانا کیا......؟

☆☆☆☆☆

دعا

ہوا جاتا ہوں دشمن کے حوالے
خدایا مجھ کو اپنے گھر بُلا لے

تری رحمت تری قدرت کے صدقے
مجھے دھوکوں فریبوں سے بچا لے

نبیؐ کی تو نے بخشی ہے قیادت
سبھی رستے ہوئے ہیں دیکھے بھالے

خدایا میری منزل روشنی ہو
تری قدرت سے اترے ہیں اجالے

مجھے تو اُن کے آگے سرخ رُو کر
جو کہتے ہیں کمالے را زوالے

دعا ثاقبؔ کی اتنی ہے خدایا
چمک اُٹھیں مرے سینے کے چھالے

آصف ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد نمازِ مدح ادا ہو تو کس طرح
کس نم مہک سے تیرے ثناگر وضو کریں

سلام مرا

دشت میں شام ہوتی جاتی تھی
ریت میں بجھ رہی تھیں وہ آنکھیں
جن کو اُنؑ کے لبوں نے چوما تھا
(جن کی خاطر بنے یہ ارض و سما)
پاس ہی جل رہے تھے وہ خیمے
جن میں خود روشنی کا ڈیرا تھا

ہر طرف تھے وہ زخم زخم بدن
جن میں ہر ایک تھا گہر تمثال
قیمتی، بے مثال ، پاکیزہ
دیکھ کر بے امان تیروں میں
ایک چھلنی ، فگار، مشکیزہ
رک رہا تھا فرات کا پانی
وقت اُلجھن میں تھا، کدھر جائے
پھیلتے جا رہے تھے ہر جانب
بے کراں درد، کے گھنے سائے
جن میں لرزاں تھی ایک حیرانی
جو کہ گمنام ہوتی جاتی تھی
دشت میں شام ہوتی جاتی تھی

پھر اُسی شام کے تسلسل میں
شام والوں نے، اہلِ کوفہ نے
جلتے خیموں سے دربدر ہوتی
روشنی کا جلوس بھی دیکھا!
خاک اور خون میں تھیں آلودہ
اُن جبینوں کی چادریں کہ جنھیں
چاندنی چھپ کے ملنے آتی تھی
وہ حیا دار تھی نظر اُن کی
جس کا سب احترام کرتے تھے
خاک برسر، برہنہ پا، خاموش
چل رہی تھیں وہ بیبیاں، جن کے
معتبر ، بے مثال شجرے کو
جُھک کے تارے سلام کرتے تھے

شہر کے راستوں کے گرد و گرد
ہر طرف تھا ہجوم لوگوں کا
خُوگرِ ظلم ، سنگ دل، قاتل
تختِ ابلیسیہ کے کارندے
سب کی آنکھوں کے سامنے ان کو
پا بہ زنجیر کھینچے جاتے تھے

امجد اسلام امجد

زمانے سے باہر

زمانی تسلسل میں
مَیں کام کرتا نہیں ہوں
زمانے سے باہر کی رو چاہیے میرے دل کو
زمانہ تو اِک جزر ہے
مَد تو باہر
کسی لازماں، لامکاں سے اُمڈتا ہے

قطاروں میں لگنے سے حاصل نہیں کچھ
کہ وہ لمحۂ مُنتظر تو
کسی اجنبی سمت سے آتے
دُم دار تارے کی صورت
---جو صدیوں میں آتا ہے---
آئے گا اور اِن قطاروں میں بھٹکے مداروں کو
مقراض کے طور سے
جانبِ عرض میں قطع کرتا نکل جائے گا

زمانے کے اِس بانجھ پَن کا مداوا
اُسی کار ہیں ہے
جدھر دیکھتے ہو
اُدھر کچھ نہیں ہے

خورشید رضوی

بکھرنے سے ذرا پہلے

ابھی آنکھیں سلامت ہیں

ابھی ان آئنوں میں روشنی کا عکس بنتا ہے

سمندر، آسماں، پتے، دریچے، بیل بوٹے

پھول، گھر، جنگل، ستارے

بستیوں کے کھوج میں نکلے مسافر

(کہ جتنے بھی ہیں سارے روشنی کے استعارے ہیں)

ابھی موجود ہیں اور اک عجب آسودگی کی لَو

سے روشن ہیں

ابھی وہ آگ جلتی ہے

جو اندھے آئنوں میں عکس کی تعمیر کرتی ہے

ابھی مَیں دیکھ سکتا ہوں

لہو کی نرم رَو سے پھوٹتے موسم کی مٹھی میں

وہ آنکھیں، جن کے دم سے عکس کی تکمیل ہوتی ہے

غلام حسین ساجد

ابھی کچھ نہ کہنا

زمانے!
یہ زخمی پرندہ ہے
یا کوئی سورج
ترے نیلے دریا کنارے پڑا جو
ستاروں کی گم گشتہ نسلوں کو گِنتا ہے
اِس کو سوا نیزے تک لوٹ آنے کی چِنتا ہے
ممنوعہ ساحل پہ بیٹھی ہُوئی
ریت کی خشک آنکھوں میں
بھیگے ہُوئے خواب
تعبیر کی کشتیوں سے اُترنے لگے ہیں
پرندے محبت کی تسبیح کرنے لگے ہیں
مجھے میرے متروک باغات سے پھول آئے ہیں
اور ایک پیغام بھی
شام بوجھل نگاہوں سے کچھ کہہ رہی ہے
جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے
فصیلوں پہ موجود زخمی چراغوں نے
پرچھائیوں سے حفاظت کا وعدہ لیا ہے
زمانے!
اس آشوب غم میں
کہیں آنکھ ہی کھُل نہ جائے
مرے آنسوؤں میں مرا خواب ہی گھُل نہ جائے!
ابھی طاق میں رکھے خوابوں کے بارے میں
کچھ بھی نہ کہنا
ابھی کچھ نہ کہنا!!

خاور اعجاز

۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء (سقوطِ مشرقی پاکستان) کی یاد میں ایک نظم

جو میرے پیارے دُلارے وطن کا حصہ تھا
جو میرا بازو تھا، میرے بدن کا حصہ تھا
جُدا ہوا ہے تو اُس کا ملال کیوں نہ کروں؟
تباہ کس نے کیا، یہ سوال کیوں نہ کروں؟

.....

جُدا ہوا جو مرے دُشمنوں کی سازش سے
اور اِس کے ساتھ کچھ اپنوں کی بھی نوازش سے
بھلا بیان مَیں یہ سارا حال کیوں نہ کروں؟
تباہ کس نے کیا، یہ سوال کیوں نہ کروں؟

.....

اُگیں گی نفرتیں ایسا گماں کہاں تھا کبھی
محبتوں کا سمندر رواں دواں تھا کبھی
مَیں اب بھی یاد وہی ماہ و سال کیوں نہ کروں
تباہ کس نے کیا، یہ سوال کیوں نہ کروں؟

.....

ہمیں تو مار گیا اُن سیاستوں کا چلن
قدم قدم پہ تھا جن میں خباثتوں کا چلن
جو دل دُکھا ہے تو ذکرِ زوال کیوں نہ کروں
تباہ کس نے کیا، یہ سوال کیوں نہ کروں؟

.....

ہمارے ماضی کے چہرے پہ جو سیاہی ہے
قدم قدم پہ جو تاریخ کی گواہی ہے
مَیں ظاہر اُس کے بھی خط و خال کیوں نہ کروں؟
تباہ کس نے کیا، یہ سوال کیوں نہ کروں؟

☆ان پاکستانیوں کا ذکر ہے جو آج بھی بنگلہ دیش کے کیمپوں میں محصور ہو کر انتہائی مشکلات میں زندگی گزار رہے ہیں۔

جو اُس زمیں پہ ہیں محصور اِک زمانے سے☆
وطن سے جو ہیں بہت دُور اِک زمانے سے
وہ زخم زخم ہیں، مَیں اندمال کیوں نہ کروں
تباہ کس نے کیا، یہ سوال کیوں نہ کروں؟

.....

کھلے ہیں ماضی کے جتنے ورق، نظر میں رکھوں
چھپے ہوئے ہیں جو اُن میں سبق، نظر میں رکھوں
وطن کو اپنے مَیں یوں بے مثال کیوں نہ کروں
تباہ کس نے کیا، یہ سوال کیوں نہ کروں؟

.....

ہمیں زوال کے موسم کو تو بدلنا ہے!
اگر زمانہ نہیں، ہم کو تو بدلنا ہے!
اِسی زوال سے کسبِ کمال کیوں نہ کروں
تباہ کس نے کیا، یہ سوال کیوں نہ کروں؟

.....

نئے سرے سے یہ پرچم بلند کرنا ہے
ہزیمتوں کا جو رستہ ہے، بند کرنا ہے
مَیں آن اپنے وطن کی بحال کیوں نہ کروں
منوّر اپنے بھی یوں خط و خال کیوں نہ کروں

.....

جو میرے پیارے دُلارے وطن کا حصہ تھا
جو میرا بازو تھا، میرے بدن کا حصہ تھا
اُسے نہ یاد کروں اور ملال کیوں نہ کروں؟

نسیمِ سحر

نظم

نظم ایسی خوبرُو دوشیزہ ہے
لفظ و معانی کے جواہر سے لدی
پیہم بنی سنوری
جو حرف و صوت کے روشن دریچے میں کھڑی
یُوں منتظر ہے
کوئی عاشق آئے
اور اسکو اشارے سے بلائے
جس کی باہوں میں وہ باہیں ڈال کر
گھر سے دبے پاؤں نکل جائے

صفدر صدیق رضی

بڑا آدمی

پسر زادے
یقیناً ایک دن
جب تم بھی دنیا کے بڑے لوگوں میں ہو گے
میں منوں مٹی تلے،
اتنی بلندی پر
تمہاری عظمت و رفعت کے منظر کو
نہ شاید دیکھ پاؤں
سو تم اپنے پیشرو مرحوم دادا کیلئے جا کر
ضرور اس دن دعائے مغفرت کرنا
کہ مجھ چھوٹے سے بندے نے سنا ہے
وہ خدائے لم یزل سب سے بڑا ہے
اور بڑے لوگوں کی سنتا ہے !

اقبال راہی کی نذر

دلوں پر کر رہے ہیں بادشاہی
ہمارے محترم اقبال راہی
سدا سے سوچ ہے ان کی فلاحی
بہت سے کام ہیں ان کے رفاہی
یہ ذہن و دل کو رکھتے ہیں منور
مِٹاتے ہیں یہ سینوں کی سیاہی
کھلا ہے آستانہ اِن کے دل کا
نہ قدغن ہے نہ ہے کوئی مناہی
جواباً بانٹتے ہیں مسکراہٹ
کوئی جتنی بکے واہی تباہی
قیادت میں اِنہی کی سربکف ہیں
سُخن کی فوج کے اکثر سپاہی
حقیقت میں یہی ہیں مغلِ اعظم
حقیقت میں یہی ظِلِ الٰہی
عطا ان کو ہوئی ہے ایسی عظمت
نہیں جاتی مِری حسرت نگاہی
یہ ایسی رفعتوں سے بہرہ ور ہیں
اِنھیں زیبا ہے راشد کجکلاہی

ممتاز راشد لاہوری

سفر کی شاخ پر

(جنابِ اختر حسین جعفری کے لیے)

سفر کی شاخ پر کھلی تھیں ملگجی بشارتیں

گشادِ حرفِ ذات سے، سوادِ زخمِ خواب تک

سفید جھاڑیوں میں تھیں شفق کی خشک بیریاں

کہ جگنوؤں نے روشنی کا پیرہن اتار کر

قدیم آسماں کے دائروں میں دفن کر دیا

نواحِ جاں میں سرمئی سی بادلوں کی ڈھیریاں

فرازِ برف زار سے، نشیبِ ماہتاب تک

غروبِ شامِ رفتگاں کی جل بجھی وصیتیں

ہجومِ رنگ میں گھرے، اُڑے اُڑے جواب تک

پسِ غبارِ آئنہ کوئی سوال رہ گیا

کہیں بس ایک عکسِ رنجِ اندمال رہ گیا

حامد یزدانی

برس کے آخری منظر.....

دسمبر رُک۔۔!
کوئی قصہ سُنا
بیتی صدی کی بات کر
کہ جب ترے نیلے گگن پر
چاند تارے جگمگاتے تھے
لحافوں میں چھپے بچے بہت حیرت سے
بڑھیا ڈھونڈتے تھے۔۔۔۔
اور وقت کا چرخہ، چرڑ چڑ
چلتا جاتا تھا۔
دھند میں ڈوبے ہوئے منظر دلوں میں ڈر جگاتے تھے
کہانی میں کئی کردار آتے تھے
کسی انجان لمحے میں
کہانی چھوڑ کر، اک موڑ پر
اِک بھیڑ میں دنیا کی کھو جاتے۔۔۔
دسمبر رُک!
کوئی قصہ سُنا
اُس موڑ کا جس پر جدائی آج بھی خیمے لگائے

منتظر ہے اُس مسافر کی
جو سرسوں کی کھلی رُت میں
ہرے سبزے پہ اُترے گا
سیہ آنکھوں میں ڈھیروں خواب بھر دے گا
تری دھندلی فضا کو ایک لمحے میں
گل و گلزار کر دے گا۔۔۔!

شبہ طراز

"زندگی ادھوری ہے"

میں ادھر کو چلتا ہوں

جس طرف اندھیرا ہو

راستہ نہیں ہوتا

آدمی ادھورا ہوں

کام بھی ادھورے ہیں

اب نشہ نہیں ہوتا

جام بھی ادھورے ہیں

رات بھی ادھوری ہے

بات بھی ادھوری ہے

کچھ بھی کر گزرنے کا

حوصلہ نہیں ہوتا

ایک شعر کہتا ہوں

دوسرا نہیں ہوتا

شاعری ادھوری ہے

زندگی ادھوری ہے

اقبال سروبہ

رشتوں کی لوٹ سیل

رشتے
اب کاغذی تعلق کی
ردی میں
مفت ملتے ہیں
رشتے
جو کبھی خون کی طرح
بہتے تھے
اس وقت
شریانوں میں کلاٹ
دھبوں کی نیلی دیواریں ہیں
رشتے
افسوس اور بین مل کر
موت کی فتح کا اعلان
آنسو بہاتے ہوئے
بے چارگی کے موسم میں کرتے ہیں

دو چار دنوں کے بعد
سب کچھ سوکھ جاتا ہے

اب رشتوں کی سیل
دکھاوے کی مارکیٹ میں
سارا سال جاری رہتی ہے

ہم
رشتوں کی اذیت کے زخموں کی
مرہم پٹی کرتے کرتے
کبھی تھک جاتے ہیں
اور کبھی لمبی نیند کے سفر پر
اکیلے، کہیں دُور نکل جاتے ہیں

امجد بابر

مقدمہ

عجب بھگدڑ ہے، شورش ہے
دماغ و قلب اُلجھے ہیں
یہ آنکھیں ہاتھ اور بازو
سبھی کیوں سہمے سہمے ہیں
اِنہیں کیا خوف لاحق ہے
زمینِ دل پہ ہر جانب
اگرچہ ہُو کا عالم ہے
مگر یہ شور کیسا ہے
یہ منظر حشر جیسا ہے
بگل بجتا ہے اور جیسے
بدن کے سارے اعضا کو کڑا اِک حکم ملتا ہے
نظر نیچی رہے تیری
سِلے ہوں ہونٹ آپس میں
کوئی ہچکی، کوئی سسکی، کوئی آواز بھی
ابھرے نہ ہونٹوں کو دلاسے کا تیقن ہو
فقط خاموشی،
چاروں سَمت خاموشی
قطار اندر قطار اک آسمانی فوج آتی ہے
خداوندِ محبت کی سواری آن پہنچی ہے
سوالوں اور جوابوں کی وہاں فہرست
چسپاں ہے
محبت سے بغاوت کے مسائل سب سے پہلے ہیں
عدالت برپا ہوتی ہے
سو کارِ عدل ہوتا ہے
کہ ملزم کو ابھی زنجیر کر لو اور لے آؤ
دماغ و قلب حاضر ہیں
یہ آنکھیں، ہاتھ اور پاؤں
گواہی کو پہنچ جائیں
فصیلِ دل کے کونے سے اچانک ہوک اٹھتی ہے
کسی زنجیر کی جھنکار ہے شاید
عجب سی دھند چھائی ہے
نظر ہی کچھ نہیں آتا
مگر معلوم پڑتا ہے
کوئی الجھا سا چہرہ ہے
پریشاں جس کی زلفیں ہیں
خمیدہ ہے کمر جس کی
بندھے ہیں ہاتھ پاؤں بھی
سیہ چادر ہے کاندھوں پر
سپاہی اس کو بازو سے پکڑ کر پیش کرتے ہیں
لو ملزم آ چکا آقا!
اجازت ہو تو تفصیلِ گنہگاری پڑھی جائے
اجازت مرحمت ٹھہری
فرشتہ فردِ الزامات پڑھتا ہے
مرے آقا! یہ ملزم ہے محبت کا
اسے معلوم تھا سب کچھ
محبت کس کو کہتے ہیں

کہ اس کے رنج و غم کیا ہیں
قوانینِ جدائی سے مکمل آشنا بھی تھا
اسے معلوم تھا سب کچھ
کہ کیسے ملنا جلنا ہے
یہاں کیا کیا لٹانا ہے
یہاں کیا کیا بچانا ہے
اصولِ مے کشی کیا ہیں
اصولِ دل لگی کیا ہیں
برائے عاشقی کیا ہے
اِسے معلوم تھا سب کچھ
کہ اس کارِ محبت میں خسارہ ہی خسارہ ہے
یہ ایسا کام ہے جس میں
شراکت چل نہیں سکتی
یہاں سود و زیاں سارے منافع جان کر منظور ہوتے ہیں
کہ آہ و زاریاں اس میں بڑا بدنام کرتی ہیں
اِسے معلوم تھا سب کچھ
کہ تنہا جینا پڑتا ہے
خوشی میں رونا پڑتا ہے
غموں میں ہنسنا پڑتا ہے
یہ کیسے بھول سکتا تھا محبت کے تقاضوں کو
یہ مجرم ہے خدائے عشق و مستی کا
کہ اس بدبخت نے اکثر
خدائے عشق و مستی کے
بنائے ضابطے، قانون توڑے ہیں
محبت کر کے پچھتایا
ذرا سا ہجر کیا آیا،
جدائی کیا ہوئی کچھ دن،
کہ اس بدبخت نے دنیا میں واویلا کیا بے حد
بڑا اودھم مچایا تھا،
بدن کو خاک کر ڈالا
خس و خاشاک کر ڈالا
خداوندِ محبت! یہ تو مجرم ہے محبت کا
اسے سنسان جنگل کی سزا تجویز ہوتی ہے
جہاں کے پیڑ سوکھے ہوں
کوئی طائر نہ ہو جس میں
جہاں خوشبو، ستارے چاند اور سورج
کسی صورت نہیں یہ دیکھ پائے اور
جہاں بس ایک موسم ہو
فراق و ہجر کا موسم
یہ جھگڑا اب بھی جاری ہے
عدالت روز لگتی ہے
یہ ملزم روز آتا ہے
گواہی روز ہوتی ہے
خداوندِ محبت نے خدا جانے کیا سوچا ہے
معافی مل نہیں سکتی، سزا وہ دے نہیں سکتے
محبت کی بغاوت کی فقط ہے یہ سزا، دانش
اِسے اِس گومگو میں روز جینا، روز مرنا ہے

☆☆☆☆☆

دانش عزیز

علامہ اقبال کے لیے

خوش بخت ہیں ہم لوگ ہمیں دیس ملا ہے
اک مردِ قلندر کے جو خوابوں کا صلہ ہے

لب سوختہ اس قوم کو پھر اُس نے زباں دی
یورپ کے بھی ایوانوں میں جس وقت اذاں دی

سوئی ہوئی اس قوم کی غیرت کو جگایا
اک نعرۂ تکبیر تھا جس وقت لگایا

وہ مردِ مجاہد کہ جو کردار کا غازی
تھی فکر جداگانہ کہ افکار کا غازی

اس دور کے ہادی میں بھی وہ سوچ کہاں ہے
جو فکر تری نظم کے شعروں میں رواں ہے

تاریخ کے اوراق پہ یہ بات لکھی ہے
اقبال تو اس دور کا رہبر ہے ولی ہے

اقبال ترے خواب کی تعبیر جدا ہے
اس وقت مرے دیس کی تصویر جدا ہے

ارشد محمود ارشد

رات کی رات

شام اُتری
بدن پر حسین لمس کے پھول کھلنے لگے
قرب کی لو سرہانے سرہانے جلی
خواب گاہوں کے پیچھے
ہواؤں کے پر نرم خوابوں کی آہٹ سے
ملنے لگے
شام اُتری بدن پر حسین لمس کے پھول کھلنے لگے
دھیرے دھیرے رواں
کاروانِ فلک پر ستاروں کے جھرمٹ میں
ڈوبی ہوئی رات جانے لگی
چاہتوں کی ہوا سرسرانے لگی
بند کمروں میں
کھڑکی کے پردے اُٹھے
ساعتِ سحر نے ادھ کھلی چشم کو
خواب سے جاگنے کا اشارہ دیا
صبح کی بارگاہوں میں ننھی کرن
روشنی روشنی پھڑ پھڑانے لگی
رات جانے لگی
گرم پانی کے ٹب میں
محبت کی ابرق بہائی گئی
''آملیٹ اور بریڈ
چائے دانی میں پانی اُبلنے لگا''
''میری ٹائی کہاں ہے''
''اٹھاؤ یہ جوتے انھیں کر کے پالش مرے پاس لاؤ''
''یہ صورت مرے سامنے سے ہٹاؤ''
اور
چاہت بھری نرم ٹھنڈی ہوا
دل کی دہلیز پر
سر جھکائے کھڑی
سوچتی رہ گئی
''پیار کی کس قدر مختصر بات تھی
یہ پسندیدگی رات کی رات تھی''

رخشندہ نوید

نثری نظم

اکیلے پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے
آخر کوئی کب تک خود سے باتیں کر سکتا ہے
سناٹے بھی اکتانے لگتے ہیں
کمرے میں خامشی نے ہنگامہ مچا رکھا ہے
اب تو دیواروں سے باتیں کرنا بھی خوش نہیں آتا
انکی آوازیں بھی سمع خراشی کا سبب بننے لگی ہیں
دروازہ جب بھی بند کرو
منتظر ہوا دستک دے کر پھر پٹ وا کر دیتی ہے
موتیے کی کلیاں مرجھانے لگی ہیں
گلدان میں سجائے پھول مہک کھو چکے ہیں
یادوں پر فراموشی کی پھپھوندی جمنے لگی ہے
آنکھوں میں ٹھہرے اشکوں پر منجمد پانیوں کی طرح کائی جم گئی ہے
تیرے کاندھے پر سر رکھ کر آنسو بہانے کی خواہش مدت پوری کرنے کے بعد
ایکسپائر ہو چکی ہے
تنہائی کے ساتھ دوستی کے دعوے کے باوجود بھی
میں نے کبھی کبھی خود کو ٹوٹتے ہوئے محسوس کیا ہے
درد کے لمحوں میں کسی بہت اپنے کے آپکے پاس ہونے کا احساس درد کی شدت کو ختم تو نہیں
کم ضرور کر دیتا ہے
"دکھ بھی تو خوشیوں کی مانند آدھا آدھا بانٹا جا سکتا تھا"

نائیلہ راٹھور

علامہ اقبالؒ

سب سے ہٹ کر ہے زاویہ اُس کا
شعر پرور ہے فلسفہ اُس کا

وہ زمانے کا شاعرِ اعظم
کیا کسی سے مقابلہ اُس کا

روح کی تہ میں جا اُترتا ہے
سن کے دیکھو تو زمزمہ اُس کا

اُس نے کھولے "خودی" کے سب "اسرار"
حق نما ہے مکاشفہ اُس کا

"بے خودی" کے "رموز" فاش ہوئے
ذات سے ہے مکالمہ اُس کا

وہ سفیرِ "پیامِ مشرق" ہے
شہرہ مغرب میں جابجا اُس کا

عرب آثار ہے "زبورِ عجم"
عالمی ہے رُخِ نوا اُس کا

رمزِ "جاوید نامہ" لافانی
ہے دوامی لکھا ہوا اُس کا

گونج "بانگِ درا" کی پھیل گئی
رشکِ منزل ہے قافلہ اُس کا

"بالِ جبریل" یہ بتاتی ہے
ہے فلک سے سفر ورا اُس کا

ہے مؤثر کلام "ضربِ کلیم"
زورِ ایمان بے بہا اُس کا

بے تبرا ہنوز کچھ بونے
نہیں کرتے جو تذکرہ اُس کا

نام اسلام کا وہ لیتا ہے
یہ گنہ سب سے ہے بڑا اُس کا

میر و سودا سے، ذوق و غالب سے
کیجیے مت موازنہ اُس کا

یہ تو سب عکسِ حسنِ فطرت ہیں
اور حقیت ہے آئنہ اُس کا

"ارمغانِ حجاز" میں فیضانؔ
دیکھیے عشقِ مصطفیٰؐ اُس کا

فیض رسول فیضان

افسوس

[نثری نظم]

ایک لمبا افسوس
میرے دل کی راہ داریوں میں
چکراتا پھرتا ہے
اک گہرے زخم کی ٹیس
آنکھوں میں اندھیرا بھرتی ہے
کیسی دوستی ہے
جو سوچ کی حدود سے ماورا ہے
بے پلکوں کی آنکھوں میں
گلے تیرتے ہیں
خموشی گھر کے کونوں کھدروں میں رینگتی ہے
لفظ کی گولیوں میں شہد نہیں ہے
جو دل کے آر پار ہوتی ہے
وہ بے دلیل کی آواز ہے
کر، خت اور کریہہ
خشک حلقوں میں پتھروں کی بارش ہے
میں نے کہا دلیل لاؤ
وہ اپنے پھٹے ہوئے گریبانوں میں نہیں جھانکتے
سینے میں پنپنے والا جنگل
چڑیوں کی آواز سے خالی ہے
وہاں سانپ اور بچھو کا ڈنک تیرتا ہے
وہاں اژدر اور افعی کے ڈیرے ہیں
لفظوں کی گل کاری
بدن کے ناسور نہیں ڈھانپتی
رنگوں کی مالا، زخموں پہ نہیں چڑھائی جاتی
ہوس کاری نے عقل و خرد ماؤف کر دیئے
کس سے کہیے
اپنی برہنہ ٹانگوں پر رینگتے سانپوں کو کیسے کھینچوں
ذہنوں کی معزولی
لمحے بھر کے نشاط کی قیمت زندگی سے وصول کرتی ہے
حسرت و یاس کی دھوپ نے
پلاسٹک سے بنا چہرہ پگھلا دیا
اب کچھ نہیں ہو سکتا
وقت نے سب کچھ حالات کے
کوڑا دان میں ڈال دیا ہے

آسناتھ کنول

آخر دستک

شہرِ وفا کے سب دروازوں پر

زنگ آلود قفل پڑے ہوئے تھے

مجسمہ نما لوگوں پر محبت بے اثر ہے

لاپرواہی کی زمیں پر
محبت کا پھول سوکھ جاتا ہے

آج بھی دل کے کہنے پر
آخری دستک دے کر
سوچ رہی ہوں

نم آنکھیں پونچھ رہی ہوں
میں خالی ہاتھ لوٹ رہی ہوں۔۔۔

فرح شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تہی تاثیر تھا ہر شعر خالد
کسی جنگل میں یہ آہو نہیں تھا

نئی نویلی دلہن

نئی نویلی دُلہن
وہ بھی پہلی رات کی دُلہن
پیا مِلن کی جوت جگائے
اپنا من آنگن مہکائے
بے چینی میں کروٹیں لیتی
مٹی کے بستر پر لیٹی
نیند اُسے آئے تو کیسے !
اپنا جی بہلائے کیسے!

اک لمحہ اک دن کے برابر
اور وہ دن بھی ہجر کا پہلا دن
اِدھر اُدھر اک پل کے لئے بھی جائے
خیال تو کیسے!
آنکھیں ایک ہی رستا دیکھیں
ہر آنے والے سے پوچھیں
سوئی کی ٹِک ٹِک
دل کی دھڑکن
لیکن اُسے اُمید مِلن کی

نئی نویلی پہلی رات کی دُلہن
جس کے پیا کو
نیند آئے، نہ اُونگھ
وہ سُنتا ہے
دیکھتا ہے وہ
جو کوئی سُنے، نہ دیکھے

اُس کا عشق ہے سب سے سچا
ساتھ نہ چھوڑے
آس نہ توڑے
کون ہے اُس سے اچھا

ایسا پیا اگر مِل جائے
پھول ہو جو مُرجھانے والا
وہ کِھل جائے
بخت کسی کا سویا ہوا ہو
وہ جاگ اُٹھے

لیکن پیا سے عشق اتنا آسان نہیں ہے
حالانکہ اِس میں کوئی نقصان نہیں ہے
پیا کی مرضی پر راضی رہنا پڑتا ہے
جو بھی ملے دکھ درد وہ سہنا پڑتا ہے

اُس دُلہن کے بدن سے مہکے
قبر کی مٹی
اور اُس کا استقبال کرے
پھر اُس سے کون سوال کرے
پیا کی نظریں جس پر ٹھہریں
ہو جائے وہ سدا سُہاگن
نیند اُسے پھر کیسے آئے
جسے مِلن کی آس جگائے

ظہور چوہان

یہ در ہے وفا کا۔۔۔!!!

(شہنشاہ وفا، قمر بنی ہاشم کے نام)

صحیفوں سے ہٹ کر
خفی کچھ اشارے
پرے دورِ قوسِ قزح سے پرے ہیں
زمانوں کی بانہوں میں
جگمگ ستارے
مگر بے زمانی کی بے انت رہ میں
سجائے ہیں کس نے۔۔۔ یہ ٹوٹے کنارے
جہاں شب بھی آئے
جہاں۔۔ راگ گائے
جہاں چاند سورج بھی آ کر نہائے
جہاں پر خزاں مست جھولے جھلائے
جہاں صبح سوئے
جہاں رات جاگے سبھی کو جگائے
جہاں وجد میں ہوں
یہ ارض و سما بھی
جہاں پر ستارے کہانی سنائیں
جہاں جانے والے سبھی لوٹ آئیں
جہاں جز میں کل ہو
جہاں کل میں جز ہو
وہاں ساعتیں پھر کھڑی مسکرائیں
وہاں ہوں گی سجدوں میں روتی صدائیں
جھکی ہیں نگاہیں
کھڑی ہیں ادائیں
یہ در ہے جہاں بھیک مانگیں وفائیں
یہ شہرِ وفا ہے
یہ در ہے وفا کا۔۔۔!!!

سید تحسین گیلانی

انمول

یہ لکڑی ہے
یہ بالکل عام سی لکڑی کا ٹکڑا ہے
فقط دو چار سکوں میں بڑھئی نے یہ خریدا ہے
مگر جب کاری گر اس کو تراشے گا
تو کرکٹ کا یہ اِک بلا بنے گا
وہ کاری گر اسے دکان پر جب کم روپوں میں بیچ ڈالے گا
دکاں سے اِک کھلاڑی یہ خریدے گا
بہت ہی تھوڑے پیسوں میں
کرکٹ عالمی میلے میں وہ اِک میچ کے دوران میں
جب آخری اوور کی بالکل آخری ہی بال پر چھکا لگا کر
میچ کا پانسہ پلٹ دے گا۔۔۔
تو دنیا بھر میں چھا جائے گا وہ ہیرو۔۔۔
ہر اک جانب سے ہی داد و دہش کے پھول برسیں گے

یہ بلا۔۔!
اب کہ لکڑی کا کوئی معمولی سا ٹکڑا نہیں ہے
ہزاروں ڈالروں میں اس کی قیمت ہے
سنو!
سادہ سے معمولی سے یہ الفاظ ہوتے ہیں
جنھیں ہم روز سنتے ہیں
سعادت مند گھڑیوں میں
یہی الفاظ جب شاعر ادا کرتے ہیں
تو سچائیوں کا بول ہوتے ہیں
بہت انمول ہوتے ہیں

زعیم رشید

نظم

دیکھ چاندسی لڑکی
اس طرح نہیں کرتے
ضبط کی طنابوں کو
جس نے تھام رکھا ہو
صبر کی سواری پر
خوب جم کے بیٹھا ہو
چھوٹی چھوٹی باتوں پر
کھلکھلا کے ہنستا ہو
جس کی مسکراہٹ بھی
دل شکستہ لگتی ہو.....
اک شکست خوردہ کی
آنکھ کی اداسی کو
اور دل کے زخموں کو
جھانک تو نہیں لیتے!!!
قہقہوں کی رونق میں
چیختے ملالوں کو
سن نہیں لیا کرتے!!!
وہ جو ایک مدت سے
ہر کسی سے کہتا ہو
"فرق کچھ نہیں پڑتا"
مجھ کو روٹھ جانے کا
"میں بہت بہادر ہوں"
یوں ہی خود فریبی سے
خود کو جھانسا دیتا ہو
اک حسین دھوکے میں
زندگی گزرتی ہو.....
اس کی خود فریبی کو
یوں عیاں نہیں کرتے
سامنے تو شیشے کے
رکھ نہیں دیا کرتے!!!
تم کو کیا بتاؤں میں
مشکلوں کے لمحوں میں
صدیاں بیت جاتی ہیں
اور پھر کئی راتیں
رتجگوں میں کٹتی ہیں
خواب ہی نہیں آتے
درد کے کئی لمحے
روح چیر دیتے ہوں
دیکھ چاندسی لڑکی
کون یہ بتائے گا
اب کے خود کو سینے میں
دیر کتنی لگنی ہے
دیر کتنی لگنی ہے.....

عاصمہ شہزادی

اُداسی بھی معطر ہے

ہوائے دل!
متاعِ جاں!
تمہاری داستاں میں کرب ہے خوشبو کے موسم کا
کہ جب بھی پھول کھلتے ہیں
زمیں پر ناتمامی کا عجب دکھ پھیل جاتا ہے
یہاں رنگوں کے پیراہن سدا مغموم رہتے ہیں
تماشائی فروزاں حسن کے باطن کے جلووں سے
خود اپنی بدنصیبی کے سبب محروم رہتے ہیں
ہوائے دل!
فضائے درد میں کوئی فسوں سا ہے
تمہاری بے بسی میں بھی جمالِ حزن بستا ہے
دیارِ خواب میں اترو
تو پھر مردہ گلابوں کی مہک آواز دیتی ہے
تمہاری سرخوشی بیتی رتوں میں خوبصورت تھی
تو یہ غم بھی منوّر ہے
ہوائے دل!
متاعِ جاں!
تمہارا دکھ
مقدس ہے، مطہر ہے
اَلم میں بھی نفاست ہے
اُداسی بھی معطر ہے!

از ہر ندیم

خطوط

آصف ثاقب

بیاض افتادِ پیارے عمران منظور صاحب

السلام علیکم!

''بیاض'' کا انتظار تھا۔ آج 8 نومبر کو آنکھیں ''سلونی'' ہوئیں۔ باعثِ تاخیر بھی کچھ ہوگا۔ خالد احمد کی نظم ''الجھن'' بڑی سمائی کی چیز ہے۔ آپ جانیں میں خالد احمد کے کلام بلاغت نظام کا شیدائی ہوں۔ ڈکشن میں احساس و فکر کی گہری جاذبیت کا اہتمام ان کی بہترین شعری ''عادت'' ہے۔ فکری بے ساختگی خالد احمد کی شاعری کا مابہ الامتیاز ہے۔ ''خطوط'' میں نقد و نظر، فہم و شعور کے روشن اسباق بہم ہوتے ہیں۔ سخن فہمی کے خرد آموز پیرائے بھی ملتے ہیں۔ مشفق خواجہ کی بتائی ہوئی غلط فہمی کہاں کہاں موجود ہے، یہ سوچنا پڑے گا۔ آفتاب احمد ملک صاحب اس ناچیز کو یاد رکھتے ہیں کوئی کسی بہانے لکھے نہ لکھے وہ لکھتے ہیں۔ نسیم سحر صاحب مہربان دوست ہیں۔ محبت کے آداب ان کے ناخنوں میں پڑے ہیں کمال یہ ہوا کہ رانا محمد شاہد صاحب کے ہاں بھی میں بول پڑا ہوں ایک پراسرار نوشت میں ایک عام سا انسان گزر کر لے تو دیکھا چاہیے۔

شاہد ماکلی صاحب ''شاعر امروز'' کے باب میں اپنی سی کر دیکھ رہے ہیں۔ لیکن یہ کیا شاعر امروز خط لکھ کر ''بیاض'' کی حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔ شہیر تہامی فرماتے ہیں:

سگرٹوں کی یہ راکھ راکھ نہیں
یہ مری فکر کا برادہ ہے

شعیب افضال کا پہلے شعری مجموعے میں ارشاد:

کچھ اور دیکھنے کا مجھے اشتیاق ہے
یہ بے نگاہ بان ! تو کیا کیا دکھائے گا

احمد حسین مجاہد نے کتاب میں حشر برپا کیا اب مضمون میں موتی موتی رواں دواں ہیں۔ ''بیاض'' اور مجاہد کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خیر اندیش

محمد ارشاد

محترم عمران منظور صاحب سلام!

یہ بات کچھ سچ ہی لگتی ہے کہ لکھنے والے اپنا لکھا ہی پڑھتے ہیں۔ کوئی اور تحریر کوئی کوئی ہی پڑھتا ہے۔ بیاض ستمبر، میں مجھ سے ایک فاش غلطی سرزد ہوئی لیکن کسی نے گرفت نہیں کی۔ میں نے لکھا تھا ''مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اپنی کسی تحریر میں عباؤں کی آستینوں کی درازی کے الفاظ لکھتے تھے جنھیں ندیم صاحب نے قباؤں کی آستینوں کر دیا، اردو میں عبا چادر کو کہتے ہیں یہی معنی ان کے پیش نظر تھے۔ ''معلوم نہیں کس کیفیت کے زیر اثر اپنے خط (بیاض ستمبر 21) میں ردا کو عبا لکھ گیا۔ ندیم صاحب نے ردا کو قبا کیا تھا کہ اردو میں ردا چادر کو کہتے ہیں عبا کو نہیں۔ البتہ فارسی میں ردا بھی عبا اور قبا کی طرح کا پہناوا ہے اور آستینوں کے بغیر نہیں ہوتا۔ قاچاری دور کے کاخ گلستاں (تہران) اس دور کے نوادرات خانے میں ردا، عبا اور قبا تینوں ایک ساتھ لٹکتے اب بھی موجود ہوں گے۔ دوسری غلطی 'بیاض' (اکتوبر) میں کر گیا۔ محمد عوفی کی لباب الالباب میں مسعود سعد سلمان لاہوری کی جائے پیدائش ہمدان پڑھی وہی لکھ دی۔ جبکہ درست جائے پیدائش لاہور ہے ہمدان نہیں، خود اس کے اپنے بقول:

مولدم لاہور و از لاہور دُور
دُور از لاہور کے باشد سرور

طالب انصاری نے قتیل شفائی کے شعر پر اعتراض کا معقول جواب دیا ہے۔ قتیل نے دیکھنے والوں کے کہنے کی بات کی تھی۔ تاج محل کا حسن دیکھ کر ایک اسرائے ہند (نام یاد نہیں آرہا) کی بیوی نے کہا تھا کہ اگر میرے مرنے کے بعد میری قبر پر بھی ایسی ہی عمارت تعمیر ہو تو ابھی مرنا چاہوں گی۔ سخن فہمی اور سخن شناسی کا زعم ہر کسی کو ہو سکتا ہے۔ نیاز فتحپوری کے پائے کا صاحب علم و فضل آج ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا لیکن جب شعر میں فلسفہ در آئے تو سخن فہمی اور سخن شناسی ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ نیاز فتحپوری بھی کئی اور شارحین کی طرح غالب کے اس شعر:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

کو شاہکار باور کرتے تھے۔ آج تک واہ واہ ہو رہی ہے، شعر میں موجود نقص سے کوئی آگاہ نہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ پہلا قدم اعیان ثابتہ (معلومات الٰہیہ) ہے جو فی الخارج موجود نہیں۔ دوسرا قدم دشت امکاں (کائنات و مافیہا) فی الخارج موجود۔ حکم کن انہی اعیان ثابتہ کو ہوا۔ کن فیکون۔ دونوں قدم مذکور اور رت سے دوسرے قدم کا سوال نا سمجھی، جہل اور لغو۔ دشت امکاں بیدل سے مستعار ترکیب، بیدل کے کئی بار یہ ترکیب کائنات و مافیہا کے لیے برتی ہے۔ غزل اور رباعی دونوں میں برموقع و برمحل اپنی پوری معنویت کے ساتھ۔ غالب کے شعر میں وہ قرینہ استعمال موجود نہیں جو بیدل کے پاس ہے:

خلقے بہ غبار دشتِ امکاں گم شد
ساغر بکف و گل گریباں گم شد
اے شمع خموش فکرِ پرتو تا چند
روز ہمہ کس دریں شبستاں گم شد

اقبال کا یہ کہنا قافیے کا تقاضا نہیں تھا:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

بلکہ اظہار ہے اس سلسلے کا جو صوفیا کا اصطلاح میں تجدد امثال کہلاتا ہے۔

شاعری کے موضوعات مخصوص و محدود نہیں، صرف شعریت درکار ہے، جس کے بغیر شعر قافلہ پیمائی ہے۔ اکثر شعرا اسی کام میں مصروف بھی رہتے رہے ہیں۔ ایسی شاعری کو ہی حیض الرجال (مردوں کا حیض) کہا گیا ہے۔ ایسے شاعروں کی شاعری کی عمر ان کی اپنی عمر سے زیادہ نہیں ہوتی چاہے وقتی طور پر کتنے ہی مقبول کیوں نہ ہوں۔ بقائے دوام کے دربار میں رسائی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ عبدالحمید عدم فلسفے، سائنس اور ریاضی کو شاعری سے دُور دراز کی چیز سمجھتے تھے۔ حالانکہ شاعری کا دامن اتنا ہی وسیع ہے جتنا کہ زندگی اور اس کے شئون کا دامن۔ فلسفہ، سائنس اور ریاضی تک اس کے شئون میں شامل ہیں۔ اقبال نے یونہی نہیں کہہ دیا تھا:

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

اقبال کی شاعری، اقبال کا فلسفہ ہی تو ہے۔ یہی حال بیدل کی شاعری کا ہے۔ بقول اقبال شنکر آچاریہ کے بعد ہندوستان میں بیدل سے بڑا اور کوئی فلسفی پیدا نہیں ہوا۔ یہی حال رومی اور عطار کی شاعری کا ہے۔ عدم صاحب تو بیدل اور اقبال کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ عدم کو وقتی طور پر بے حد مقبولیت حاصل ہوئی لیکن اس شاعری کی عمر عدم کی عمر سے زیادہ نہیں تھی۔ آج کتنے لوگ عدم کو پڑھتے ہیں۔ محض شراب کے موضوع پر شاعری جاندار ہوتی تو ریاض خیرآبادی نے اس موضوع پر جتنے دلآویز اشعار کہے، عدم ایک بھی نہیں کہہ پائے:

جام مے توبہ شکن توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

شگفت انگیز یہ کہ ریاض نے شراب چکھی تک نہیں تھی۔

گناہ کوئی نہ کرتے شراب ہی پیتے
یہ کیا کیا کہ گنہ تو کیے شراب نہ پی

عدم نے عمر خیام کو بھی اپنا ہم مشرب اور رند شرابی گمان کیا۔ اپنے آپ کو خیام کا جائز جانشین اور رباعیات خیام کے منظوم ترجمے کے اہل۔ رباعی کہنی آتی نہیں تھی۔ قطعات کہے رباعی کا مفہوم کچھ اور، ترجمہ کچھ اور، ہر رباعی کے مقابلے میں اپنا قطعہ دے دیا اور "دو جام" کے نام سے کتاب چھپوا دی۔ معلوم نہیں خیام سے مقابلہ مقصود تھا یا "کمال" کا اظہار مطلوب تھا یا خیام پر برتری جتانا چاہی تھی۔ شراب سے خیام کی مراد کہیں نشۂ زندگی اور کہیں نشۂ موت ہے۔

آہ ایں چہ شراب است کہ تا روز شمار
بیخود شدہ و بیخبر اند از ہمہ کار

خیام مراد وی معنوی میں تو شاعر بھی نہیں تھا، کوئی 'بیاض' مرتب نہیں کر رکھی تھی۔ فلسفے، سائنس اور ریاضی کے مسائل حل کرتے کرتے تھکتا تو کاغذ کے کسی پرزے پر تھکاوٹ دور کرنے کی غرض سے کوئی رباعی لکھ دیتا۔ ڈھونڈنے والوں نے انہی پرزوں سے جسد رباعیات مرتب کیں۔ سائنس اور ریاضی اس دور کے فلسفے میں شامل تھے۔ غیر اقلیدی جیومیٹری کا جس پر آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی بنیاد ہے۔ وہی آغاز کنندہ ہے۔ اپنی تصنیف مصادرات علی اقلیدس میں اقلیدس کے دور سے مقبول چلے آنے والے اس مسلمہ کو کہ دو متوازی خطوط کہیں بھی آپس میں نہیں ملتے، غلط ثابت کر دیا۔ کیا یہ بات عجیب نہیں کہ جن رباعیات کی اپنے قریبی ساتھیوں اور شاگردوں کو ہوا تک نہیں لگنے دی ان کے ترجمے آج دنیا کی ہر ادبی زبان میں موجود ہیں ایک نہیں کئی کئی یہاں تک کہ مصنوعی زبان اسپرانٹو میں رباعیات کا منظوم ترجمہ بھی موجود ہے اور عجیب تر یہ ایک غیر شاعر دنیا کا مقبول ترین شاعر بن گیا ہے۔

غالب فارسی میں سبک ہندی کے نظیری نیشاپوری، عرفی شیرازی، صائب تبریزی، طالب آملی، کلیم کاشانی کے سے اجلہ شعرا کی فکر کا شاعر تھا۔ بیدل کا طرز کلام ان سے مختلف اور منفرد تھا اور بیدل غالب کا آئیڈیل۔ وہ اردو میں بیدل کی سی منفرد شاعری کرنا چاہتا تھا۔ اردو فارسی کے مقابلے میں بے مایہ ہونے کی وجہ سے بیدل کے سے طرز کلام کو سنبھال نہیں پا سکتی تھی۔ دوسری کی دیکھا دیکھی نے چال کو وبال بنا دیا۔ اس کے ہم عصر فارسی سے نابلد نہیں تھے۔ لیکن غالب کی اردو شاعری آدھا تیتر آدھا بٹیر پائی طنز و تمسخر پر اتر آئے تاہم اس کی فارسی شاعری پر نکتہ چینی کی ہمت کسی کو نہ ہوئی۔ وہی غالب جب فارسی بولتا ہے تو موتی رولتا ہے۔ کاش میں اس تفصیل میں پڑ سکتا:

اپنی اُردو شاعری کی زبان کے بارے میں اشکال کا احساس غالب کو تھا ایک رباعی میں کہا:

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

غالب کی مخالفت میں معاصرانہ چشمک بھی شامل تھی، اس سے قطع نظر جو زبان استعمال کی شعریت اس کے نیچے دب گئی، جس کا احساس غالب کو بھی تھا۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

فنون میں بزمانۂ ادارت ندیم میں نے غالب کی فارسی اور اردو شاعری کے تناظر میں غالب کے اسی **Predicament** کی بات کیا کی بھڑوں کو چھیڑ بیٹھا۔ انور شعور اور آصف ثاقب کو تو یاد ہی ہوگا۔ نتیجے میں چلنے والی بحث میں کچھ نہ کچھ حصہ انھوں نے بھی لیا تھا۔ غالب کا معاملہ ابو تمام کے معاملے سے مختلف نہیں تھا جب عبداللہ بن طاہر کے دربار میں ابو تمام نے اپنا پہلا شعر سنایا تو ابو العمیثل نے کہا: لِم ما تقول ما یُفہم (وہ کیوں نہیں کہتے جو سمجھ میں آئے) تو ابو تمام نے مسکت جواب دیا: لِم لا تفہم ما یقال (جو کہا جائے وہ کیوں نہیں سمجھتے)۔ میں غالب دشمن نہیں تھا، یہی سمجھا گیا، اگر سمجھا گیا تو بھی کیا برا ہوا۔ خیر:

دود آں شعلہ کہ امروز بہ ہمسایہ رسید
ز آتشے بود کہ در خانۂ من پا گرفت

میں شعر و ادب کا آدمی نہیں حرف تمنا نے مجھے اس طرف جھانکنے کی طرف مائل کیے رکھا ہے۔ فلسفے کے سوا میرے پاس کوئی ڈگری نہیں، یہی پڑھا اور پڑھایا۔ سیکھا اور سکھایا ہے۔

کرامت بخاری

محترم عمران منظور صاحب

جناب رضوی صاحب

مزاج گرامی قدر۔ آپ کا "ریاض" حسب روایت جامع، وقیع اور موثر نظر آیا۔ آپ نے مکتوبات کا سلسلہ شروع کرکے اسے ایک مکمل جریدہ ادب بنا دیا ہے۔ اس دفعہ دیگر مندرجات جس میں 60 یا 70 احباب کے کلام کو جگہ دی گئی ہے وہاں جناب جمیل یوسف صاحب کے خط اور مضمون کو جگہ دے کر اس پرچے کی اہمیت کو دوچند کر دیا گیا ہے۔ جناب جمیل یوسف صاحب ہمارے سینئر لکھنے والے ہیں ان کے خیالات سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر مخالفت پر نہیں اترنا چاہیے۔ وہ سچے، کھرے اور بے لوث آدمی ہیں ہمارے ہاں چونکہ توصیف، تعریف، مصلحت اور منافقت نے جگہ گھیر لی ہے اور سچ کے لیے کوئی گوشہ نہیں بچا، اس لیے ان کی تحریروں کے خلاف بات چل پڑی ہے، ورنہ جمیل یوسف صاحب شعر فہمی، شعر شناسی اور شعر گوئی میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا ہونا ازبس ضروری ہے بلکہ صحت مند معاشرہ کی علامت ہے۔ ڈاکٹر انور سدید، جلیل عالی اور دیگر احباب کے حوالے سے ان کے نظریات کو دلیل کے ساتھ دیکھا جائے نہ کہ شخصی مخالفت کی نظر سے، کوئی بھی تخلیق جب چھپ جاتی ہے تو وہ ادب کا حصہ ہو جاتی ہے اور اس پر قارئین، ناقدین اور دانشور اپنی رائے دیتے ہیں۔ آخر کوئی تو ہو جو سچ لکھے اور مصلحت اور منافقت کو ایک طرف رکھ کر صرف اور صرف معیار، وقار اور اعتبار کی بات کرے ایسا ایک شخص سینکڑوں پر بھاری ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے زبان و بیان کی صحت، مقصدیت، معنویت اور ماہیت کا احساس فزوں تر رہتا ہے۔ آپ کے پرچے کے لیے اپنی غزلیں روانہ کر رہا ہوں امید ہے پسند آئیں گی، احباب کو آداب۔

مخلص

نسیم سحر

پیارے صاحبان مہربان ریاض۔ سلام مسنون۔ کرونا نے تو آپ کا کچھ نہ بگاڑا تھا مگر ٹی ایل پی نے کاروبار بھی اور راستے بھی بند کر دیے، چنانچہ اس بار کا شمارہ بھی غیر معمولی تاخیر سے ۵ نومبر کو ملا۔ اس تاریخ تک بھی پرچے کی اشاعت تک کے تمام مراحل طے کرنے میں آپ کو جتنی دشواریاں اور رکاوٹیں پیش آئی ہوں گی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سو آپ کو سلام تحسین پیش کرنا تو بنتا ہے۔

اس شمارے کی منظومات میں سے اپنی پسند کے اشعار ان اشعار کے تخلیق کاروں کو داد کے طور پر لکھ رہا ہوں: حمدیہ اشعار:

ہزار عمر خضر بھی ادائے شکر کو کم — کسی بھی طور مکمل نہ ہو بیان حمد
ریاض سوچ یہ غربال لفظ کے اندر — سمٹ سکے گا کبھی بحر بیکران حمد؟
ڈاکٹر ریاض مجید

نعتیہ اشعار:

روحیں تکتی ہیں وہ مرحوم ثنا خوانوں کی — صبح دم ہوتے ہیں جو روضے پہ طائر حاضر
ڈاکٹر ریاض مجید

مقدس شہر کا پانی پی رہا ہوں — مدینے کا پیالہ مل گیا ہے
آصف ثاقب

ان کے ذکر کا ہالہ ٹھہرے، کیا عجز اظہار — وہ جان جاں، وہ آقا، وہ دلبر وہ دلدار
خالد احمد

وقت بنجر تھا مگر آپ کی رحمت کے طفیل — شجر زیست پہ کیا خوب ثمر آیا ہے
سید ریاض حسین زیدی

پھول جھڑتے ہیں ان کے ہونٹوں سے
کیا فصاحت مرے حضورؐ کی ہے
محمد انیس انصاری

اذنِ ممدوح سے کھلتی ہے گرہ مدحت کی
وہ نہ چاہیں تو کہاں نعت لکھی جاتی ہے
سرور حسین نقشبندی

اتنی زرخیز زمیں ہے کہ ثنا کرتے ہوئے
اک نئی نعت کا پیلو بھی نکل آیا ہے
شاہد اشرف

دعائیہ یا عقیدتی اشعار:

درج ذیل اشعار اُس کلام میں سے جسے آپ نے دعایا عقیدت کے عنوان سے شائع کیا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ نعت کے اشعار ہی بنتے ہیں:

یہ سرزمین بھی جنت سے کم نہیں ہے اگر
یہاں ہر آدمی کا احترام ہو جائے
جمیل یوسف

سردارِ کائناتؐ ہیں میرے حضور پاک
تجھ سے ہی ان کا نُور معطر، مرے خدا
ڈاکٹر فرحت عباس

یوں بھیج درود اُن پہ کہ آفاق پکاریں
اے صلِ علیٰ، ہم پہ تحیات رقم کر
مرزا آصف رسول

برادرم خاور اعجاز آج کل ہائیکو تراجم خوب بھیج رہے ہیں۔ غالباً یہ اُن دنوں لکھے گئے تھے جب جاپانی سفارتخانے کے اشتراک سے پاکستان ہائیکو سوسائٹی ہر سال ایک بڑا ہائیکو مشاعرہ کرایا کرتی تھی، ان کے یہ عمدہ تراجم دیکھ کر میرا بھی جی چاہ رہا ہے کہ ایسے ہی کچھ مترجمہ ہائیکو میں بھی ارسال کروں۔

غزلوں کے چنیدہ اشعار:

ہم سفری کیا ، ہم نظری کیا
ہو گا جدھر کو جلوۂ عکسِ جمالِ یار
سانپ کو سانپ نگل جائے گا
منہ پھیر دیں گے ہم بھی اُدھر اِس زمین کا
خالد احمد
خاور اعجاز

چمک رہے ہیں محبت کی خوشخطی کی طرح
بس ایک بار ہی تو نے چھوا تھا شاخوں کو
تجھے جو گال پہ تتلی سدا دیے ہم نے
پھر اس کے بعد عجب تھی مہک چنبیلی میں
آصف ثاقب
حسن عباس رضا

ناراج کیے اس نے جنوں خیز حوالے
بہت سے لوگ ہمیں چھوڑ کر روانہ ہوئے
اب سوچ اجالوں کی طرف اس کی نظر ہے
سو اتنے چھوڑنے والوں میں ایک میں بھی سہی
جلیل عالی
خالد علیم

وہ جس سے اپنی ملاقات ہو نہیں سکتی
الفاظ کے پیرہن میں آ کر
ہمیں اسی سے ملاقات راس آتی ہے
مجروح خیال ہو گیا ہے
جمیل یوسف
سید قاسم جلال

ایک تو اُردو زباں اُس پہ وہ لہجے کی کھنک
ذرا گزر تو سہی بے ثبات عالم سے
دیر تک بولنے دیتا ہوں اگر بولتا ہے
اسی کے بعد مقام ثبات ملتا ہے
اعجاز کنور راجہ
رشید آفرین

پیچھے میرے ٹریفک جام
محبت کے سبھی موسم ادھورے
آگے سڑک پہ دھرنا ہے
محبت کا کوئی موسم نہیں ہے
محمد انیس انصاری
سید مقبول حسین

نہ مل سکی کبھی استقائی انترے کے گلے
ہزار بار اگرچہ میں گنگنایا گیا
رحمان حفیظ

ہجوم عشق و محبت کی کھینچا تانی اب
ہر ایک شکل کو بے شکل کرنے والی ہے
ڈاکٹر فرحت عباس

مری زبان کو لکنت نے آ لیا تھا مگر
وہ ہنس پڑا تو میں بہتر کلام کرنے لگا
سعید راجہ

خواب میں سامنے رہتا ہے تمہارا چہرہ
رات بھر ایک پرستان میں رہتا ہوں میں
اشرف کمال

سامنے ہونے کا مطلب دل میں ہونا تو نہیں
دل میں ہونے کے کئی آداب ہیں دلگیر پہ
انیس احمد

ایک مدت کی مسافت کا نتیجہ جاذب
اصل میں اپنی طرف ایک قدم ہوتا ہے
اکرم جاذب

کچھ روز میری آنکھ سے اوجھل رہا ہے تو
کچھ روز میں نے اوڑھ کے رکھی ردائے خواب
افتخار شاہد

اس کی خوشبو لپٹ گئی مجھ سے
آج گزرا تھا اس کے پاس سے میں
ارشد محمود ارشد

نرم لہجے میں بات کرتا ہے
جس کے دل میں رہے خدا کا ڈر
ملیحہ سید

عجیب تر ہے بھری کائنات کا منظر
شروع ہو تو کہیں اختتام ہے ہی نہیں
میں فکر مند نہیں ہوں کہ یہ بساط جہاں
کسی کا ہو گا، مرا انتظام ہے ہی نہیں
صائمہ آفتاب

کچھ مناجات رات کو ہوں گی
کچھ مناجات شام سے پہلے
شفیق آصف

بتائے رنج فراہم تو ہے کہیں نہ کہیں
نظر نہ آتا ہو، اک غم تو ہے کہیں نہ کہیں
عابد سیال

سانس لینے میں ہو گئی دقت
تیرے سینے میں رک گیا ہوں میں
شاہد اشرف

ماورا ہے تو ہر تخیل سے
روشنی ہے ترے جمال میں ضم
محمد نوید مرزا

اسے کہو کہ مجھے قید سے رہائی دے
وہ جس نے مجھ کو بٹھایا ہے خاص لوگوں میں
اسحاق وردگ

اب کوئی اور کام کرنا ہے
خاک چھنی تھی، چھان لی میں نے
مظہر حسین سید

دیکھتے ہی دیکھتے پتھر ہوئے ہیں آئنے
آئنے پتھر ہوئے ہیں آنکھوں کے شہر میں
ریاض ندیم نیازی

نہار و لیل کے وقفے میں چلتا رہتا ہے
سے میں اپنے ہونے کا اشتہار مرا
شاہد ماکلی

روح پہ جسم تنگ اضافی ہے
چھوڑ دوں گا یہ خاکداں مرے دوست
اعجاز ثاقب

بزم آرائی سے بس اتنا سمجھ پائی ہوں
میری خوشیوں کا سبب میرا اکیلا پن ہے
عنبرین خان

بیٹھیے، اور بھی کرنی ہیں ضروری باتیں
ایک تو یہ کہ دوبارہ نہ یہاں آئیے گا
شمیم ملک

مرا خیال ہے وہ عشق میں پڑا ہی نہیں
جو کار عشق کو کار زیاں بتاتا ہے
طارق نعیم

اسے پڑھ کر اٹھاؤ لطف آخر تم بھی شاعر ہو
مری تازہ غزل سچ مچ تصور ایک تحفہ ہے
تصور اقبال

سرد راتوں میں کام آتی ہے
یاد بھی گرم لوئی ہے صاحب
طالب انصاری

پیار پنچھی جلتے ہیں، مر جاتے ہیں
دل والوں کی ذات جلالی ہوتی ہے
وحید ناز

مرا مسلک، مرا فرقہ اداسی ہے
دلِ وحشی کسی دکھ کی حلاوت کر
احمد محمود

انصاف نہیں اس کو ملا ہو گا مسلسل
یوں ہی کوئی توقیرِ عدالت نہیں کرتا
نفیس فاروق

اسے کہو کہ مرا گاؤں دل کشادہ ہے
اسے کہو کہ نہ شرمائے، بے جھجک آئے
طاہر مظفر ملک

گر قید مسلسل کی کہانی نہیں سنتا
آنچل سے ذرا زاہد گرہ گیر نکالے
انور شیرازی

جوق در جوق آ رہے ہیں لوگ
سب سے اونچی اذان ہے میری
سرفراز تبسم

آ گیا تو بس خدا ہونے کا ہی گر سیکھ کر
کل کلاں پھر آدمی تجھ کو اگر ہونا پڑا؟
عزم الحسنین عزمی

اس مرتبہ نظموں کا حصہ بھی غزلوں کے حصے ہی کی طرح جاندار ہے اور اس میں جہاں کلاسیکی انداز کی نظمیں اچھی ہیں وہیں جدید ڈکشن اور اسلوب کی کچھ عمدہ نظمیں بھی پسند آئیں۔ نظموں کا انتخاب پیش کرنے سے بات نہیں بنتی اس لیے صرف اتنا کہوں گا کہ اگرچہ تمام نظمیں اچھی تھیں مگر حسن عسکری کاظمی، خاور اعجاز، گلزار بخاری، خالد نعیم، حامد یزدانی، علی اصغر عباس، محمد نوید مرزا کی نظموں نے زیادہ متوجہ کیا۔

اس مرتبہ کسی نثری تحریر پر تبصرہ نہیں کر رہا اگرچہ ہر تحریر پر بھی ہے اور اس پر کچھ لکھنے کا ارادہ بھی تھا مگر خط طویل ہوتا جاتا ہے اور اگر زیادہ طویل ہو جائے تو شاید کسی اور کا حق مارا جائے چنانچہ میں ضبطِ نفس سے کام لے رہا ہوں۔

ممتاز راشد لاہوری

محترم عمران منظور صاحب، محترم نعمان منظور صاحب

آداب و تسلیمات۔

"بیاض" (اکتوبر 2021) ہمدست و نظر نواز ہوا۔ خالد احمد (مرحوم) کی مصطفیٰ زیدی (مرحوم) کے بارے میں چار اشعار کی نظم نے خوب لطف دیا۔ اس بار سحر اور سرور حسین نقشبندی کی حمدیں اور نعتیں زیادہ پُر سوز محسوس ہوئیں۔ خاور اعجاز کے ہائیکوز اور گلزار بخاری کا گیت دلکش رہا۔ آپ نے انہی صفحات پر میرے چھ اردو ماہیے بھی شامل کیے ہیں، جن کے لیے دل شکریہ۔

آپ بیتی میں شوکت علی شاہ نے بیوروکریٹس کے معمولات کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ فکر انگیز بھی ہے اور المناک بھی۔ رخشندہ نوید اور صوفیہ بیدار نے اپنی اپنی یادیں دہرائی ہیں اور عمدگی سے بیان کی ہیں۔ غزلوں کا حصہ حسبِ روایت سب سے جاندار اور مضبوط رہا۔ خورشید رضوی، جلیل عالی، جمیل یوسف، انور شعور، غلام حسین ساجد، قاسم جلال، سید ضیا حسین، اسلام عظمی، حامد یزدانی، علی اصغر عباس، خالد علیم، آفتاب خان، محمد نوید مرزا، صغیر احمد صغیر، عدنان خالد، رفعت وحید اور عمران عمران کی غزلیں زیادہ پُر تاثیر لگیں۔ نظموں کے حصے میں شبہ طراز، رخشندہ نوید، خالق آرزو اور اعجاز رضوی کی نظمیں بہت خوب تھیں۔ مضامین کا حصہ ابھی نہیں پڑھ سکا۔ خطوط کے حصے میں سے بھی تین احباب کے خطوط ہی پڑھے ہیں۔ مجموعی طور پر "بیاض" کا یہ شمارہ بھی باکمال تھا۔ "بیاض" کے سبھی بہی خواہوں کے لیے نیک تمنائیں ہیں۔

خیر اندیش

آفتاب احمد ملک

برادر ذی وقار عمران منظور صاحب!

سلام نیاز مندانہ!!

شمارہ نومبر کی بروقت موصولی، حسب سابق 241 صفحات پر مشتمل جریدہ ادب، بدلتے موسم کی فرنٹ ٹائٹل پر عکاسی، اندرون صفحات پر ترتیبی رنگ و روپ، پچھلے شمارے کی اطلاع کہ صفحات کم ہوں گے

فلاں فلاں مضامین اشاعت پذیر نہیں ہوں گے۔ خدشات و تحفظات غائب شد____ ممنون ہوں۔ 'شاہ و داستان' میں محترم شوکت علی شاہ صاحب نے دوران ملازمت برپا ہونے والے واقعات کمالات کا اپنی نقاد قلم سے خوب تجزیہ کیا ہے۔ اسلام آباد ظلام آباد ہے بقول شاہ دلی کے کہ "دارالحکومت نہیں بلکہ سول سروس کا قبرستان ہے۔" (صفحہ نمبر 68) 10 صفحات پر آپ بیتی نو وارد افسران کے لیے گائیڈ لائن ہے۔

تصوف کے معنی خیز مضمون میں سلیمان عبداللہ ڈار نے خوابیدہ افراد کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ "عرض تمنا" دل کی آواز سننے کی ہدایت کی۔ (صفحہ نمبر 32)___

احمد حسین مجاہد نے (صفحہ نمبر 175-172) برادرم آصف ثاقب کی شخصیت اور اکادمی کی جانب سے مطبوعہ شخصی کتاب "پاکستانی ادب کے معمار" کے سلسلے میں آبائی قصبہ میں منعقدہ خوبصورت تقریب کی تفصیلی روداد بلکہ مختصر سفرنامہ تحریر کیا۔ کافی معلوماتی و دلچسپ ہے۔ اکادمی کا تحریری کارنامہ قابل صد تحسین ہے۔ "بوئی والا بابا" عنوان خوب ہے۔

حسن عسکری کاظمی نے معروف شاعر کرامت بخاری کے خوبصورت کلام و شخصیت کے حوالے سے 6 صفحات پر مبنی تنقیدی مضمون لکھا اور بہترین اشعار کا انتخاب اچھا لگا۔ حامد یزدانی صاحب نے سید آل احمد کے ادبی کمالات پر تفصیلی کالم لکھا۔ معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا (صفحہ نمبر 192-186)

اعجاز ثاقب نے ممتاز شاعر شارق جمال خان کے مجموعہ کلام "فسانہ کون و مکاں" پر مع اشعار خوب تبصرہ کیا۔ فاضل مبصر نے اشعار بھی کمال کے لکھے ہیں۔ ایک ایک شعر الگ کتاب کا متقاضی ہے۔ وطن عزیز کے سفیر شاعر باقی احمد پوری کی شاعری اور خوبصورت شخصیت پر مکمل احاطہ کر کے 8 صفحات پر مضمون لکھا ہے۔ مضمون نگار شاعر علی شاعر نے عنوان کا انتخاب "حسین تخیلات کا شاعر" قاری کی دلچسپی کا باعث ہے۔ شاہد ماکلی نوعمر شعرا کے متلاشی ہیں۔ ہر ماہ دو شعرا کا تعارف سخن وران ادب کی کہکشاں میں اضافہ ہوتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں شعیب افضال کی تاریخ پیدائش قصبہ ضلع درج نہیں کیا؟ موصوف ہر نئے دوست کے تعارفی شخصی خاکے میں ابتدائی کوائف ضرور تحریر فرمائیں تاکہ قارئین ادب کی معلوماتی ڈائریکٹری میں اضافہ ہو۔ چھ افسانہ نگار (خواتین حضرات) نے اپنے مخصوص افسانوی رنگ میں افسانے تحریر کیے ہیں۔ عمر رواں میں بہت نئے رویوں سے افسانے جنم لے رہے ہیں۔

حمد و نعت کے صفحات میں شعرا عظام نے رب کائنات کی جلوہ گری (حاکمیت اعلیٰ) اور رسالت مآب رسول اعظمؐ کی رحمۃ اللعالمینی کو خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ نعت کا شعر دیکھیے گا____

کتابوں میں پڑھا سیرت کا حصہ   درود پاک سے ہر اُمتی کی
مقالے سا مقالہ مل گیا ہے   طبیعت کو سنبھالا مل گیا ہے

آصف ثاقب

عالی آئی ہے سوز سخن ہے سو اس لیے   خالی نہ بیت نعت سے کوئی غزل گئی

جلیل عالی

تخلیقی اذہان کا رنگ تغزل دیکھیے۔ ہر غزل نئے تخیلات و استعارات سے مزین قارئین کو حصار میں رکھتی ہے۔

بہت خیال ہے اپنے سخن کی عظمت کا
کہے جو شعر وہ تم کو سنا دیے ہم نے
غمِ فراق کا اس دم ہوا ہے اندازہ
جب اپنے صحن سے پنچھی اڑا دیے ہم نے
آصف ثاقب

کرتا ہے وہ تردید مری میری غزل میں
عالی پہ مری طرزِ فغاں ہی کا اثر ہے
جلیل عالی

میں جانتا ہوں ، خزاں فصلِ گل کا وقفہ ہے
مجھے بہار کی ہر بات راس آتی ہے
جمیل یوسف

ایک تو اردو زباں ، اُس پہ وہ لہجے کی کھنک
دیر تک بولنے دیتا ہوں اگر بولتا ہے
اعجاز کنور راجہ

احوال کیا بتایئے اوروں کا بے خبر
اس پیش کو غریب کو اپنی خبر بھی ہو
حسن عسکری کاظمی

کل اُس نگر میں تھا آرزو گانِ دل کا ہجوم
تو آج اُن کے حوالوں میں ایک کہیں بھی سہی
خالد علیم

اب کچھ تو جواب دے زمانہ
ہر چہرہ سوال ہو گیا ہے
سید قاسم جلال

محبت کے سبھی موسم ادھورے
محبت کا کوئی موسم نہیں ہے
سید مقبول حسین

چراغِ طور بن کر یہ ترے افکار چمکیں گے
کبھی تو یاد آئے گا ترے کردار کا موسم
یہی اک فلسفہ اقبال کا ، اقبال نے سمجھا
خزاں کی زد پہ رہتا ہے ہمیشہ پیار کا موسم
اقبال سروبہ

میں غزل کہتا، تو رک جاتا زمانہ سننے
لفظ تصویریں بنا دیتا ، جو شاعر ہوتا
اکرم ناصر

دو دو قدم بھی ساتھ ہمارے نہ چل سکا
دریا پہ دوستو ، ہمیں کیا کیا گماں تھے
خورشید ربانی

شہرِ جاناں میں گزارے ہوئے لمحے ، شوکت
شہرِ دیگر میں بسیرا نہیں ہونے دیتے
شوکت محمود شوکت

گفتگو کرتا ہوں گاؤں میں درختوں سے کمال
شہر میں شور کے ہیجان میں رہتا ہوں اکیلا
اشرف کمال

ٹوٹی ہوئی منڈیر پہ اوندھا ہوا چراغ
سوئی پڑی ہے شام سے شاہد سرائے خواب
افتخار شاہد

دل ہمارا دھڑکا رخشندہ اچھا تو نہیں
شاخ پہ پنچھی ان کو پھڑپھڑاتے ، دیکھ کر
رخشندہ نوید

میرے خستہ مکاں کا حصہ ہے
آندھیوں اور تجھ گھٹا کا ڈر
ملیحہ سید

لغت میں لفظ "وفا" کے کئی معنی ہیں
سو اپنی شرع میں بدعت حرام ہے ہی نہیں
صائمہ آفتاب

ٹوٹا ہوا قلم ، خواب سنہرے، دو کتابیں
کھویا ہوا بچپن مجھے لٹتے میں ملا ہے
ماجد یزدانی

چاندنی ، درد ، یاد تنہائی
یوں بھی ہوتی ہے بزم آرائی
شمینہ سید

قصہ گو ، ہچکیوں میں ڈوب گیا
ختم ہوتے ہی داستاں مرے دوست
اعجاز ثاقب

ہمارے حرف کیا ہیں اور ہماری فکر کیا ہے
دل و جاں میں سرایت خوبصورت صورتیں ہیں
بشیر احمد حبیب

محترمہ فرخندہ شمیم صاحبہ کی ڈاکٹر عبدالقدیر خان (مرحوم) پر تعزیتی نظم پڑھی۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ بقول انور مسعود کے:

یہ ارضِ پاک کا ہے جگر پاش واقعہ
تھا سرزمینِ پاک کا وہ محسنِ اعظم
کس کو قدیر خان کی رحلت کا غم نہیں

خالد احمد (مرحوم) کے درج ذیل اشعار میں کمال کا غنائی جادو ہے کہ ایکبار پڑھنے سے حفظ ہو جاتے ہیں۔

کیسی میٹھی مہک محبت تھی ۔۔۔ شعر، فنِ حنوط کاری ہے
بیت دیوانِ غزل تھا خالد ۔۔۔ یاد مجھ کو بھی تھا، پھر بھول گیا
حادثوں نے کر دیا شاعر مجھے ۔۔۔ کام یہ بھی اکتسابی ہو گیا

سات خطوط نگاروں کے مختصر طویل تبصرہ جات گزشتہ شمارے پر تنقیدی آراء و تجاویز ہیں۔ احباب کی خیر و عافیت تحریباً پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ ورنہ زندہ تحریریں ایک دوسرے سے ہمکلام ہیں۔

اشرف کمال

محترم عمران منظور، نعمان منظور صاحب

السلام علیکم

ماہنامہ بیاض کا شمارہ نومبر ۲۰۲۱ء میرے ہاتھوں میں ہے۔ حسب سابق ٹائٹل سادہ ہے مگر خوش رنگ۔

شروع میں حمد و نعت کے اشعار میں آصف ثاقب کا شعر حوالوں کی معتبر کہانی بیان کرتا ہے:

رسائی ہو گئی اپنی خدا تک ۔۔۔ محمدؐ کا حوالہ مل گیا ہے

غزل کے درج ذیل اشعار خوب ہیں:

چاہا ہے اسے میں نے محبت کے سوا بھی
کچھ اس سے تعلق ہے رفاقت کے سوا بھی
محسن اسرار

اب کچھ تو جواب دے زمانہ
ہر چہرہ سوال ہو گیا ہے
سید قاسم جلال

کہیں مٹایا گیا تو کہیں بنایا گیا
میں اتنا یاد رہا جتنا بھلایا گیا
رحمان حفیظ

وہ دو قدم بھی ساتھ ہمارے نہ چل سکا
دریا پہ دوستو ہمیں کیا کیا گمان تھے
خورشید ربانی

عجیب تر ہے بھری کائنات کا منظر
شروع ہو تو کہیں اختتام ہے ہی نہیں
صائمہ آفتاب

جسے آنے والے پرندے پڑھیں گے
ہواؤں پہ لکھی وہ تحریر ہیں ہم
شفیق آصف

یہ کون جانے کہاں ہوں میں اور کہاں نہیں ہوں
جہاں نظر آ رہا ہوں اب کے وہاں نہیں ہوں
دستگیر قمر

شعر کے بارے میں خالد احمد کا نظریہ ملاحظہ کیجئے کہ کس طرح محبت کو حنوط کر کے خوشبو بکھیرنے کے عمل کو طویل کیا ہے:

کیسی میٹھی مہک محبت تھی
شعر، فنِ حنوط کاری ہے

خالد احمد کی نظم "تمام نام ترے نام نے تراشے ہیں" میں خدا سے اپنے لبوں کی بے ریا دعاؤں کو سننے کی گزارش کی گئی ہے۔

اور مکمل نہ دیکھنے کا کرب انسان کو نا آسودہ رکھتا ہے، بے خبر رکھتا ہے

دیکھا نہ نہیں تو نے خط وخال سے آگے
اک شہر تھا، اس مہ وسال سے آگے

(خالد احمد)

ماشاءاللہ یہ شمارہ نظم، حمد ونعت، افسانہ غزل اور خطوط پہ مشتمل اپنے معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

آستاتھ کنول

جناب عمران منظور صاحب!

آداب!

امید ہے بخیر ہوں گے۔ ''بیاض'' کی عمر دراز ہو۔ ہمیشہ وقت پر موصول ہو جاتا ہے۔ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ ''بیاض'' نظر نواز ہوا۔ ''مصطفیٰ زیدی'' کے اشعار کے ساتھ رسالے کا آغاز، شاہ اللہ خالد احمد صاحب شاعری کے آسمان کے تابندہ ستارے تھے، جو پوری آب وتاب سے چمکتے رہے۔ ''بیاض'' ان کی یادگار ہے۔

شاندار رسالہ جو ادبی طالب علموں کی پیاس بجھاتا ہے۔ آپ نے اس مرتبہ نثر نگاروں کو اطلاع بہم پہنچائی۔ لکھنے کے حوالے سے یہ بھی اچھا ہے۔ خالصتاً ادبی تحاریر کو جگہ دی جائے تو رسالہ اور شاندار ہو جائے گا۔ رشی خان کا افسانہ بہت پسند آیا۔ بشریٰ رحمٰن تو خیر کمال کا لکھتی ہیں باقی بھی ٹھیک ہی تھے۔ (صوفیہ بیدار کی یادیں) بہت عمدہ تحریر۔ غزلیں، نظمیں سبھی زبردست۔

خطوط پڑھنے کا اپنا مزہ ہے۔ (شوکت علی شاہ کی آپ بیتی) ہمیشہ کی طرح پُراثر۔

کس کس چیز کی تعریف کیجیے۔

راحت سرحدی صاحب کی خوبصورت غزل کا ایک شعر جو بہت پسند آیا:

ہمراہ کہیں میں نے برے وقت میں اپنے
لوگوں کو تو چھوڑو کبھی سایا نہیں دیکھا

سلامت رہیے!

محمد شفیق انصاری

محترم عمران منظور بھائی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید واثق ہے کہ آپ اور ''بیاض'' کی ساری ٹیم کے ارکان خداوند کریم کے خاص فضل وکرم سے بخیریت سے ہوں گے۔ ایک لمبے عرصے کے بعد یہ خط لکھ کر ''بیاض'' سے اپنا رشتہ بحال کر رہا ہوں۔ بلاشک وشبہ اب ادبی پرچوں میں ''بیاض'' واحد ادبی جریدہ ہے جو بروقت چھپ کر ہر ماہ کی یکم تاریخ کو اپنے چاہنے والوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے آپ لوگوں کی شبانہ روز محنت وکوشش کارفرما ہے۔

ماہ نومبر کے 'بیاض' کا آغاز حسن عسکری کاظمی کی حمد سے ہوتا ہے، لیکن 'بیاض' کھولتے ہی سب سے پہلے مرشدی خالد احمد کی تصویر پہ نظر پڑی اور اُن کا خوبصورت اور دلگداز کلام ''الجھنیں'' پڑھ کر خوشی ہوئی:

حسن عسکری کاظمی کی حمد کا خوبصورت شعر:

غفار ہے وہ میں نے اُٹھائے دعا کے ہاتھ
صد شکر مغفرت کا سبب چشمِ تر میں ہے

حصہ نعت میں:

ملتجی ہوں تری رحمت ہو قریں رب کے حضور
ایک اک کر کے ہوں جب نعت کے شاعر حاضر
ریاض مجید

وقت بنجر تھا مگر آپؐ کی رحمت کے طفیل
شجرِ زیست پہ کیا خوب ثمر آیا ہے
سید ریاض حسین زیدی

ہم سے عاصی پکاریں گے صلی علی
بجز محمدؐ تو کوئی سفینہ نہیں
سعدیہ بشیر

حصہ نعت کے بعد جمیل یوسف کی دعا سے عقیدت اور پھر ہائیکو سے ہوتے ہوئے افسانے تک آئے تو حبیب الرحمٰن کا افسانہ ''کفن پوش'' اور ناصر نقوی کا ''لاوارث'' اور سیرا کیانی کا ''سوشل میڈیا اور ہم'' حالاتِ حاضرہ پہ خوبصورت تحریر ہے۔ شوکت علی شاہ کا ''شاہ داستان'' ماضی کے جھروکوں سے کئی در وا کرتا ہے:

پیار کی شاخ نہ سوکھنے پائے
درد کا پھول تو پھل جائے گا
خالد احمد

اک سمت محبت ہے اور اک سمت ہے شہرت
مچلا ہوا دل اُس کا اِدھر ہے نہ اُدھر ہے
جلیل عالی

اُس کی خوشبو سے مہک اُٹھتی ہے کمرے کی فضا
پھول کھلتا ہے کہ وہ بندِ قبا کھولتا ہے
اعجاز کنور راجہ

شباب اترتا ہے یکساں ہر ایک آنگن میں
وہ فرق ہی نہیں رکھتا سگی، سوتیلی میں
حسن عباس رضا

بدن کے چیتھڑے پہنے ہوئے ہیں روحوں نے
لباسِ فاخرہ میں دلکشی نہیں کوئی
علی اصغر عباس

سجا کے رکھے گی زندان میں مجھے خلقت
یہ مجھ سے آج عجب عدل کرنے والی ہے
فرحت عباس

گھر گھر رہتی ہے یہ بات
کب تک سدھریں گے حالات
ممتاز راشد لاہوری

ایک لمحے کو بھی مایوس نہیں ہوتا ہوں
اک ترے ملنے کے امکان میں رہتا ہوں میں
اشرف کمال

شام سے پہلے ہی دل میں آ گیا ترا خیال
پھول، تارے، چاندنی مہتاب ہیں دہلیز پر
انیس احمد

عین ممکن ہے اُسے کچھ یاد آئے دیکھ کر
وہ بھری محفل میں ہم کو مسکرائے، دیکھ کر
رخشندہ نوید

عجیب تر ہے بھری کائنات کا منظر
شروع ہو تو کہیں اختتام ہے ہی نہیں
صائمہ آفتاب

نئے برگ و گل ہم سے پھوٹیں گے آصف
نئے موسموں کی وہ تصویر ہیں ہم
شفیق آصف

وہ جس کے آنے کی آہٹ ہے تیرے لہجے میں
کوئی گریز کا موسم تو ہے کہیں نہ کہیں
عابد سیال

بیٹھیے! اور بھی کرنی ہیں ضروری باتیں
ایک تو یہ کہ دوبارہ نہ یہاں آئیے گا
نیلم ملک

سرد راتوں میں کام آتی ہے
یار بھی گرم لوئی ہے صاحب
طالب انصاری

شاعر امروز میں شاہد ماکلی نے شہیر تہامی اور شعیب افضال کی شاعری کا خوبصورت تعارف کروایا اور احمد حسین مجید نے آصف ثاقب بوئی ہزارہ کا خوبصورت خاکہ "بوئی والا بابا" لکھ کر ان کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے۔ حصہ نظم میں امجد اسلام امجد کے نظمانے خاصے کی چیز ہیں۔

کوئی رستہ بھی نہ ہو بچنے کا
اور دشمن پڑا ہو قدموں میں
تب مزا ہے معاف کرنے کا

امجد اسلام امجد

نسیم سحر کی نظم (بیاد خلد احمد)، حامد یزدانی کی "لکن میٹی" فرحت پروین کی "آخری بات" فرحت عباس کی "چراغ تعبیر معتبر" اور فرخندہ شمیم نے "محسن پاکستان کی نذر" لکھ کر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ٹریبوٹ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ شاعر علی شاعر نے باقی احمد پوری پر ایک اچھا مضمون حسین تخیلات کا شاعر باقی احمد پوری، لکھا اور خاور اعجاز، صفدر صدیق رضی، اسلام عظمی، خالد علیم، امجد بابر، شاہنواز زیدی، وسیم جبران اور شاہدہ مجید کی خوبصورت نظمیں "بیاض" کا حصہ ہیں۔ والسلام

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور، اعجاز رضوی صاحب السلام علیکم!

نومبر کے شمارے کا سرورق پت جھڑ کے موسم کا پتا دے رہا تھا۔ گزرے دو سال تو ادبی دنیا میں پت جھڑ کا موسم ہی رہا۔ بہت سے نامور ادیب و شاعر ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گئے۔ جن کا نعم البدل بھی شاید نہ مل سکے یہ سچ ہے کہ انسان جتنا بھی مضبوط و توانا ہو، اسے کمزور ہو کر ایک نہ ایک دن گرنا ہوتا ہے، مگر کسی کے بعد دیگرے بہت سے نامور ادیبوں و شاعروں کا یوں چلے جانا اداسی شمارے میں امجد اسلام امجد کا کہا یہ شعر یاد آ گیا:

علم و ہنر کے جرأت تحقیق کے یہاں
روشن ہے آفتاب ابھی کل کی بات ہے

روحانی موضوعات پر سلیمان عبداللہ ڈار بہت اچھا لکھتے ہیں۔ "عرض تمنا" پڑھتے ہوئے ایک خیال گزرا کہ کاش ہماری بھی آرزوئیں و تمنائیں پوری ہوں، مگر یہ اسی صورت میں ہوگا جب "میرا سر ہو، تیرا در ہو..... میرا دل ہو، تیرا گھر ہو" حبیب الرحمن کا افسانہ کفن پوش بتا رہا ہے کہ ایک لکھاری کسی کا پابند نہیں ہوتا، نہ کسی سرکاری ادارے کا اور نہ ہی کسی جریدے کے مدیر کا، اس کی پالیسی اس کی اپنی کہانیاں ہوتی ہیں۔ وہ کیمرہ کی طرح آنکھیں بند کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ خود دیکھتا ہے، اسے بیان کر دیتا ہے۔ سماج اسے باغی ضرور کہتا ہے مگر وہ اپنے ضمیر سے سمجھوتہ نہیں کرتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ منٹو جیسے لوگ تاریخ میں الگ حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ دردانہ نوشین خان کا "ہندو سراب ہے؟" اور انعام الحسن کاشمیری کا "ایک رات کا طوفان" بھی پسند آئے۔ ناصر نقوی اچھے اداکار ہی نہیں، اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ انہوں نے "لاوارث" میں سماج کے ہی مختلف رنگ پیش کیے۔ سمیرا کیانی نے اپنے افسانے "سوشل میڈیا اور ہم" میں نوجوان نسل کی نفسیات کو بڑے اچھے پیرائے میں لکھا، جو سستی شہرت کے لیے وقت اور اخلاقات کیسے برباد کر رہے ہیں۔ نظموں میں امجد اسلام امجد کے نظمانے، حامد یزدانی کی "لکن میٹی" اور وسیم جبران کی "آخری بات" پسند آئیں۔

بیاض سے پہلے سید ناصر ہاشمی کے ایک شعری مجموعے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ان کی کتاب سے دو اشعار:

جسم پہ برف اگائی جائے — دھوپ سے دھند اُڑائی جائے
خوشیوں میں بھی یار ملامت — بستی دور بسائی جائے
ریت اُڑی یوں جیسے بادل — تن سے رشتہ رکھتا کب تک
حرفوں کے بھی تن ہیں خالی — رنگوں کو میں بھرتا کب تک

جناب نسیم سحر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جو واقعہ میں کسی اور کا لکھ رہا ہوں وہ میرے ساتھ بھی ہو جائے گا۔ تقریبات و مشاعروں کے انعقام پر انتظامیہ جو رویہ ادیبوں و شاعروں کے ساتھ رکھتی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورتحال گزشتہ ہفتے ایک دو روزہ ادبی کانفرنس میں میرے ساتھ بھی ہوئی۔ تفصیل پھر سہی۔

انعام الحسن کاشمیری

محترمی ایڈیٹر! السلام علیکم۔۔

امید ہے تمام ادارتی سٹاف کے ہمراہ خوش باش ہوں گے۔ ماہ نومبر کے شمارہ میں خاکسار کا افسانہ "طوفانی رات" شامل اشاعت کرنے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ قبول کیجیے۔۔ زیرِ نظر شمارہ ہی نہیں، بیاض کا ہر شمارہ ہی درحقیقت اس قابل ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت میں شامل ہر مواد پر کھل کر گفتگو کی جائے۔ حمد و نعت سے لے کر افسانوں، مضامین سمیت خطوط کے گوشے میں ابھرتے سوالات کے جوابات دیے جائیں۔ لیکن بوجہ دفتری مصروفیات کے ایسا نہیں ہو پاتا۔ جناب جمیل یوسف کی "دعا" میں وطن عزیز کو ریاست مدینہ بننے کی جو دعا مانگی گئی ہے اللہ کرے وہ قبول ہو جائے۔ چہ جائیکہ کہ اس وقت ہمارے ہاں جو پالیسیاں چل رہی ہیں وہ اس کے بالکل ہی الٹ ہیں اور کم از کم مستقبل قریب میں ایسی کوئی امید و کلالی نہیں دیتی لیکن اللہ کے در سے مایوس بہرحال پھر بھی نہیں۔

جناب ناصر نقوی سے بحیثیت صحافی و کالم نویس واقفیت حاصل تھی لیکن اب انھیں افسانہ نگار کے روپ میں بھی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ان کا افسانہ "لاوارث" جس معاشرتی المیہ کو بیان کرتا ہے افسوس کہ یہ المیہ ہمارے نظام عدل و انصاف کی کمزوریوں اور خامیوں کے باعث روز بروز بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جس بچی کو والدین راتوں کی نیندیں حرام کر کے پرورش کرتے، پڑھاتے لکھاتے اور زندگی کی شاہراہ پر تیزی سے دوڑنے کے قابل بناتے ہیں، وہی ایک دن اس ناسمجھی کی عمر میں انھیں دغا دے کر، ان کی عزت خاک میں ملا کر، ان کے ارمانوں و مایوسیوں کی بھٹی میں جھونک کر کسی اجنبی کے ساتھ نکل کھڑی ہوتی ہے کہ وقتی تلذذ اور انجانے خوابوں کی تعبیر پانے کی خواہش سے مغلوب ہوتے ہوئے وہ یہ تک بھول چکی ہوتی ہے کہ جس اقدام نے اس کے والدین، بہن بھائیوں اور خاندان کی گردنیں جھکا دیں، وہ اسے معاشرہ میں بھلا کیونکر باعزت مقام دلوا سکتا ہے۔ یہی نہیں، جو شخص اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے وہ اپنی ہوس پوری ہونے کے بعد کیونکر اسے اپنے پاس رکھے گا کہ جس کی بدولت وہ نکاح کی صورت میں رشتے ناطوں کو دوام بخشنے والے عمل سے دور ہو گیا۔ ایسی لڑکیوں کی آخری منزل دارالامان ہی ہوتے ہیں اور اگر ہم نے اس سلسلہ میں کوئی قانون سازی نہ کی تو خدشہ ہے کہ یہ دارالامان ایسی لڑکیوں سے بھر جائیں گے اور تب ہر محلہ میں ایسی پناہ گاہیں بنانا ضروری ٹھہرے گا۔

جناب حبیب الرحمان نے "کفن پوش" میں دونوں یعنی مدیر اور لکھاری کی ذہنی عکاسی ایک ساتھ ہو رہی ہے۔ لکھاری سمجھتا ہے کہ میری تحریر معیار کے اعلیٰ پیمانوں کو چھو رہی ہے اور مدیر اسے ردی کی ٹوکری کے قابل سمجھتا ہے۔ بسا اوقات آج کے مدیر کا ذوق بھی ایسا نہیں اعلیٰ نہیں رہا کہ جس کی بدولت وہ تخلیق کے بلند معیار کو چھوتی تحریر خواہ وہ کسی بھی موضوع سے مناسبت رکھتی ہو، جانچ اور پرکھ سکے۔ دراصل آج کا مدیر دفتری مصروفیات میں ایسا الجھا ہوا ہے کہ اس کے لیے مسلسل اور مستقل مختلف النوع موضوعات پر مطالعہ کرنا ممکن نہیں رہا۔ یہی حال لکھاری کا بھی ہے۔ ضروریات زندگی نے اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ وہ اپنی تخلیق پر اس کے مطابق توجہ دے جیسا کہ ایک دور میں نمایاں عمل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب معیاری ادب کی تخلیق دھیرے دھیرے سکڑ کر عام کہانیوں، افسانوں وغیرہ تک محدود ہوتی جا رہی ہے۔ سوشل میڈیا اور ہم میں محترمہ سمیرا کیانی نے آج کی نوجوان نسل کے عمل و کردار کی بھرپور عکاسی کر کے بتا دیا ہے کہ یہ نسل سوشل میڈیائی نسل ہے جس کے احساسات و جذبات بس لائکس، کمنٹس اور سیلفیز وغیرہ کے اردگرد ہی گھومتے ہیں۔ انھیں انسان سے براہِ راست انسان کے تعلق، ہمدردی، احساس وغیرہ جیسے امور سے اب کوئی لینا دینا نہیں۔ اس ٹیکنالوجی نے دنیا کو تو گلوبل ویلج بنا دیا ہے لیکن قریب بیٹھے انسان کو بہت دور کر دیا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہے کہ ہزاروں میل دور رہنے والے سے ہماری صبح شام گپ شپ ہوتی ہے لیکن گھر میں ساتھ رہنے والے سے ہماری بول چال بند ہے۔ پہلے بچے باپ کی آواز سنتے ہی کانپتے تھے آج کے بچے کو باپ کئی دفعہ بلائے تو وہ موبائل میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ اس صدا کو ان سنی کر دیتے ہیں۔ محترمہ روحانہ نوشین خان خوب لکھتی ہیں۔ "بچہ مر اب ہے؟" میں بھی انھوں نے موضوع سے خوب انصاف کیا ہے۔

جناب شوکت علی شاہ کی "شاہ داستان" کی ہر قسط ہی بے حد دلچسپ اور تاریخ کے در بخوبی وا کرتی ہے۔ حیرت ہے کہ وہ خود بیوروکریٹ ہو کر بیوروکریسی کے بد باطن سے متعلق انکشافات کرتے چلے جا رہے ہیں۔ حالیہ قسط میں انھوں نے جو خوفناک رویے بتائے ہیں ایسا لگتا ہے کہ ہر حکمران نیک خواہشات اور ملک کی تقدیر تبدیل کرنے کی نیت کے ساتھ تخت پر براجمان ہوتا ہے لیکن بیوروکریسی انھیں اندھی گلی کی جانب دھکیل دیتی ہے۔ پرویز مشرف کی جانب سے بیوروکریسی کے پر کاٹنے اور پھر سے طاقتور ہونے کے زمرے میں انھوں نے جو بیان کیا ہے یہ درست ہے۔ پرویز مشرف نے بیوروکریسی کو بلدیاتی ناظمین وغیرہ کے ماتحت کر دیا تھا جس کے خلاف بطور احتجاج لاہور کے ڈپٹی کمشنر نے استعفا دے دیا۔ کچھ ہی عرصے میں یہ افسران پہلے سے بھی کہیں زیادہ طاقتور ہو گئے۔ یہی حال پولیس کا ہے۔ افسران قوم کے خادم نہیں، مالک ہیں۔ جناب شوکت علی شاہ کو اس جرأت رندانہ پر مبارکباد دینا چاہیے کہ ان کی تحریر ہمارے لیے معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے لیکن کئی سو کے لیے ان سے ناراضی کا موجب بھی ہے۔

والسلام۔۔۔

کلیاتِ محسن کاکوروی
ترتیب و تہذیب
ریاض ندیم نیازی

عربی شاعری کے پندرہ سو سال
عربی سے براہِ راست ترجمہ
پروفیسر ڈاکٹر خالق داد ملک
محمد احمد (ایم فل عربی)
آزاد بک ڈپو اردو بازار لاہور

ہلکے پھلکے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ
نمک زار
پروفیسر نور کمال شاہ

دنیا مری ہتھیلی پر
ظہور چوہان

اعجاز رضوی، نوید صادق، عمران اعوان، عمران منظور اور نعمان منظور

عمران منظور، اعجاز رضوی، ڈاکٹر یونس بٹ اور نعمان منظور